نہرو بال پستکالیہ
امر جیوتی
Govt. I

نہرو بال پستکالیہ — 44

# امر جیوتی

(بھارت کے سادھو سنتوں کی کہانیاں)

گوپی ناتھ تلولکر

مصور

جو مراج

مترجم

فیروز قریشی

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا نئی دلی



1979 (1901)
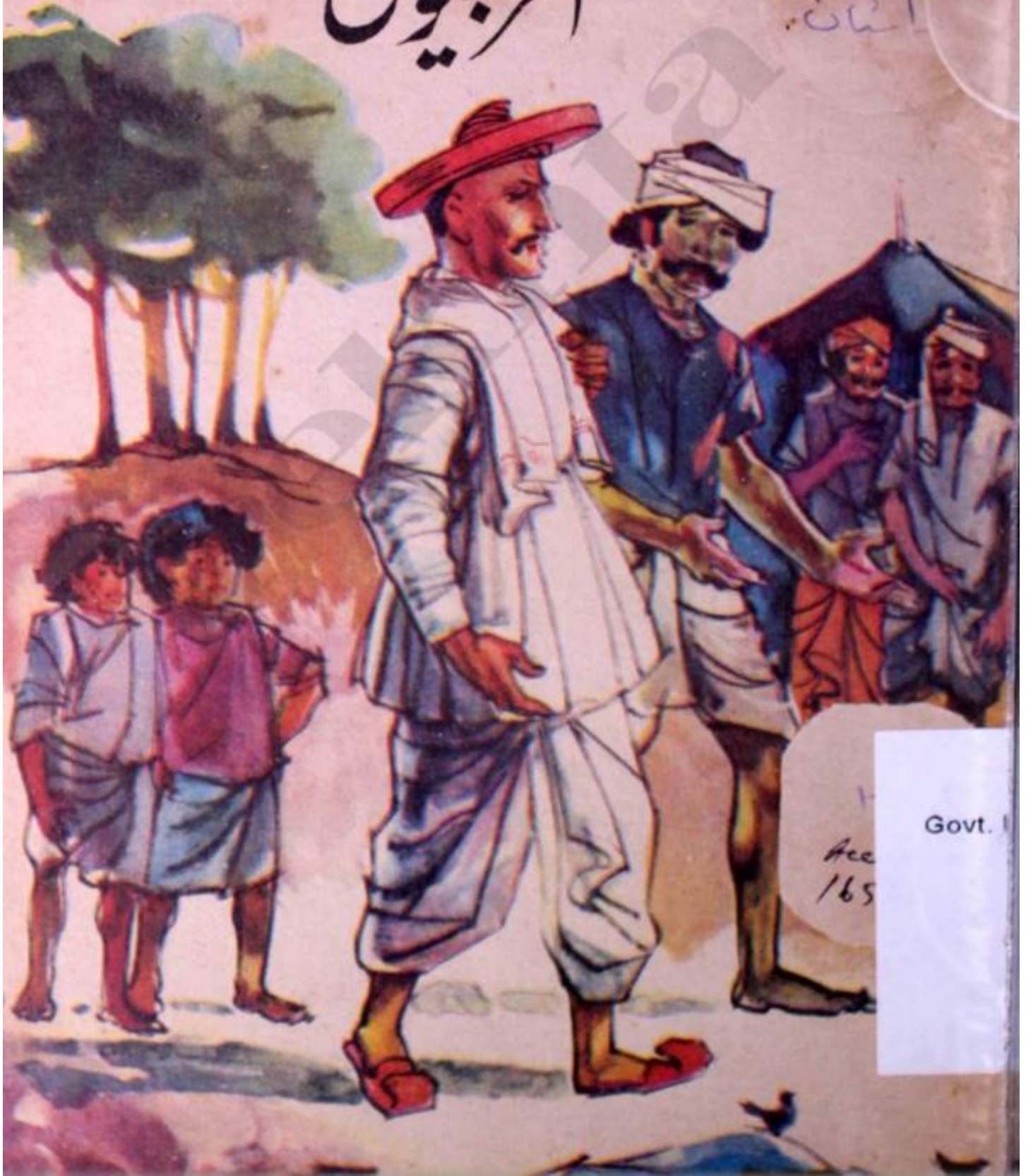


AMAR JYOTI (Urdu)

قیمت : 1/50

This book has been published on the paper supplied through the Government of India at concessional rates.

ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا 5/A گرین پارک نئی دہلی 110016 نے رکھا پرنٹرز نئی دہلی 20 میں چھپوا کر شائع کیا۔

# نانک
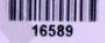
پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رات کے وقت ایک سرائے میں دو آدمی بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ ایک گرو معلوم ہوتا تھا اور دوسرا چیلا۔ گرو بارعب اور پُر جلال تھے ان کے چہرے کے چاروں طرف نور کا ہالہ سا محسوس ہوتا تھا چیلا بھی اچھا تندرست گھبرو جوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں گرو کے لیے عقیدت امڈی پڑ رہی تھی وہ گرو کے پیر دباتا
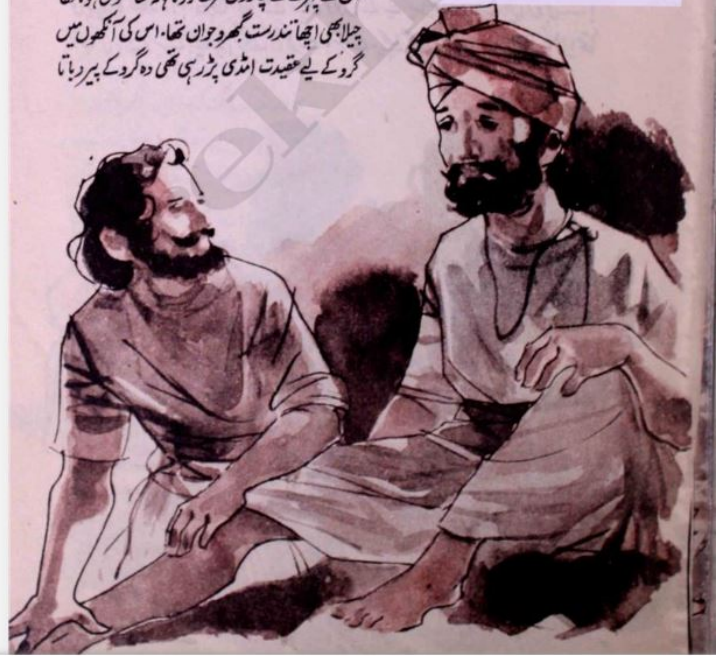
ہوا باتیں کر رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ اس کا آج کا دن کس طرح بیتا۔

اُس نے کہا "گرو جی! مہمانوں کی اتنی آؤ بھگت کرنے والا گاؤں تو میں نے آج تک نہیں دیکھا ہر دروازے پر ہمارا استقبال کیا گیا۔ عمدہ سے عمدہ چیزیں دان میں دی گئیں۔ آٹا، دودھ، کپڑے..."

گرو نے اپنی داڑھی سہلاتے ہوئے مسکرا کر کہا: "بھگوان کرے کہ یہ گاؤں برباد ہو جائے۔" چیلے کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ چیخ اٹھا "اتنے اچھے لوگوں کے لیے ایسا کیوں کہہ رہے ہیں گرو جی ——! آپ کی بات تو میرے جیسے عام لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ پچھلے گاؤں میں سب نے ہمارا مذاق اُڑایا تھا"

بے عزتی کی تھی تو اس گاؤں کو آپنے آشیرواد دیا تھا کہ خوب پھلے پھولے ایسا کیوں گروجی؟"

گروجی نے مسکرا کر کہا "جس گاؤں میں اتنے بدکردار، پاپی اور دھرم کو نہ ماننے والے ہوں ان کی کنجوسی اور بری عادتیں ان کے اپنے گاؤں میں ہی محدود رہنی چاہئیں۔ اب اس گاؤں کو ہی لو یہاں کے لوگ بھلے ہیں، دھرم کو مانتے ہیں، مہمانوں کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ اگر یہ گاؤں برباد ہو جائے گا تو یہاں کے لوگ باہر جائیں گے۔ دوسرے گاؤوں میں جا کر بسیں گے اور وہاں کے لوگوں کو بھی اچھی باتیں سکھائیں گے۔ اس طرح دوسرے لوگ بھی اچھے بنیں گے اور چاروں طرف سکھ اور خوشی پھیلے گی۔"

گرو کا جواب سن کر چیلا جس کا نام مردانا تھا، خوش ہوا۔ ایک بار پھر وہ اپنے گرو کی دانشمندی کا قایل ہو گیا تھا۔ گروجی نانک تھے، سکھ دھرم کے بانی! مردانا ان کا مرید تھا جو دن رات ساتھ رہتا اور ان کی خدمت کرتا تھا۔

پندرھویں صدی میں پنجاب کی حالت بہت خراب تھی۔ یہ بات دور دور تک پھیل



گئی تھی کہ بھارت میں بہت دولت ہے۔ درۂ خیبر سے ہو کر دوسرے ملکوں کے لوگ یہاں کی دولت لوٹنے کے لیے حملہ کرتے اور جو کچھ ہاتھ لگتا اسے لے کر چل دیتے۔ ودیشیوں کے حملوں کا دیش کی جنتا پر بڑا خراب اثر پڑا۔ لوگ دھرم کرم کو بھولنے لگے۔ ان کے چال چلن بگڑ گئے۔ نانک کا جنم ایسے ہی برے وقت میں ہوا۔ انھوں نے ایک نیا دھرم چلایا اور لوگوں کو زندگی کا مقصد سمجھایا۔ یہ دھرم آگے چل کر دیش پر بہت گہرا اور مستقل اثر ڈالنے والا تھا۔

نانک کا جنم پنجاب میں تلونڈی نامی مقام پر 15 اپریل 1469 کو ہوا تھا ان کے باپ کا نام کالو مہتا اور ماں کا نام ترپتا تھا۔ یہ کھتریوں کی ایک ذیلی ذات بیدی خاندان کے لوگ تھے۔

تلونڈی راجدھانی سے بہت دور واقع تھا اس لیے بڑے شہروں کے شور وغل سے قطعی محفوظ تھا۔ وہاں کا صوبیدار رائے بولر نامی ایک ایسا ہندو تھا جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا۔ وہ نیک اور رحم دل تھا اور اپنے کسانوں پر بہت مہربان تھا۔ نانک کے پتا کالو مہتا رائے بولر کے ماتحت کام کرتے تھے۔

بیدی کھتریوں کے رواج کے مطابق نانک کے گلے میں جنیؤ ڈالنے کا دن طے کیا گیا۔ جنیؤ تیار کیا گیا لیکن بالک نانک نے پنڈتوں سے بحث کی: "میرے گلے میں یہ دھاگا کیوں باندھ رہے ہیں آپ؟ اس میں کیا خصوصیت ہے؟ یہ ٹوٹ سکتا ہے، جل سکتا ہے۔ ایسے دھاگے کو گلے میں ڈالنے سے بہتر ہے کہ آدمی سچ بولے، نیک کام کرے اور اپنے گندے خیالات پر قابو پائے تاکہ سچائی، اطمینان اور روح کی پاکیزگی حاصل ہو۔"

بالک نانک کی باتیں سن کر لوگ دنگ رہ گئے۔

وقت آیا تو نانک کو اسکول میں داخل کیا گیا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم کے لیے مولوی کے پاس بھیجا گیا لیکن نانک کا علم گرو سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔

نانک کا بہترین استاد تو فطرت تھی۔ کبھی کبھی وہ اکیلے ہی جنگل میں نکل جاتے اور وہاں تنہائی میں بیٹھ کر "دھیان" کرتے۔ کبھی کبھی دھیان میں اتنے مگن ہوجاتے کہ ناچنے گانے لگتے۔ نانک کو گائیں چرانے کا کام سونپا گیا تھا۔ ان کو یہ کام بہت اچھا لگتا تھا کیوں کہ گایوں کو چرنے کے لیے چھوڑ کر وہ خود دھیان کرسکتے تھے۔ ایک بار گائیں کسی کھیت میں گھس گیئں اور سارا کھیت کھا ڈالا۔ کسان نے بڑی مشکل سے انھیں باہر نکالا اور غصے کے عالم میں چرواہے کی تلاش میں نکلا۔ اُس نے دیکھا کہ چرواہا مزے میں آنکھیں موندے بیٹھا ہے۔ وہ نانک کو پکڑ کر رائے بولر کے پاس لے گیا۔ نانک کے باپ نے سنا تو وہ بھی بہت بگڑے اور صوبیدار سے کہا کہ نانک کو سخت سزا دیں۔

رائے بولر بھلا آدمی تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ نانک کوئی معمولی چرواہا نہیں ہے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ کسان کا جتنا بھی نقصان ہوا ہے اُسے پورا کیا جائے۔ لیکن جب رائے بولر کے آدمی فصل تولنے بیٹھے تو وہ جتنی ہمیشہ ہوا کرتی تھی اس سے کہیں زیادہ نکلی، نقصان کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اب تو سب ہی کو یقین ہوگیا کہ نانک میں ضرور کوئی غیبی طاقت ہے۔

کچھ دن بعد نانک کو اناج کے بھنڈار کا کام سنبھالنے کے لیے سلطان پور بھیجا گیا۔ ان کا کام تھا غریبوں کو اناج بانٹنا۔ نانک دل کھول کر دان دیا کرتے تھے پھر بھی بھنڈار میں اناج کم نہیں ہوتا تھا۔

اسی دوران نانک کی شادی کردی گئی۔ ان کے دو لڑکے ہوئے لیکن وہ اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے۔ انھیں یقین تھا کہ کسی خاص کام کو پورا کرنے کے لیے ہی انھیں اس دنیا میں بھیجا گیا ہے، دوسروں کی طرح کھانے پینے اور کام کرنے کے لیے ان کا جنم نہیں ہوا ہے۔ انھیں ایسا کوئی کام کرنا ہے جس سے

دنیا والوں کو صحیح راستہ ملے، علم کی روشنی ملے۔

ایک دن وہ اشنان کے لیے ندی میں اترے اور اوجھل ہو گئے۔ لوگوں نے سمجھا ڈوب گئے۔ بہت ڈھونڈنے پر بھی ان کا جسم نہیں ملا۔ تیسرے دن وہ اپنی جل سمادھی سے خود ہی باہر نکلے۔ لوگوں کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔

انھوں نے کہا: "کوئی ہندو، کوئی مسلمان نہیں ہے۔ سب خدا کے بندے ہیں۔" اس کے بعد وہ دونوں فرقوں کو قریب لانے اور سیدھا راستہ دکھانے میں لگ گئے۔

نانک کو یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ ساری دنیا غلط راستے پر جا رہی ہے۔ لوگ خدا کو بھول گئے ہیں، مذہب کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ بغیر ملّاح کی کشتی کی طرح سماج ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اس کی ڈگمگاہٹ ختم کرکے اسے صحیح سمت میں لے جائے، نہیں تو ناؤ ڈوب جائے گی۔ اسی قسم کے خیالات نانک کے من میں اُٹھتے رہتے تھے۔ ایک دن انھوں نے اپنے خیالات کو دور دور تک پھیلانے کا فیصلہ کیا اور اپنے چہیتے شاگرد مردانا کو لے کر نکل پڑے۔

ایک بار ایک قاضی نے اپنے اور ایک مقامی نواب کے ساتھ نانک سے نماز میں شامل ہونے کے لیے کہا۔ نانک دور کھڑے رہے۔ جب نماز ختم ہوگئی تو قاضی نے نواب صاحب سے کہا: "دیکھا اس کافر کو نماز میں شامل نہیں ہوا۔ دور کھڑا دیکھتا رہا۔ اس نے اسلام کی توہین کی ہے۔ اسے سزا دیجیے۔" نانک نے مسکرا کر کہا: "قاضی صاحب، آپ تو صرف نماز پڑھنے کا دکھاوا کر رہے تھے۔ آپ ویسے تو قرآن کی آیتیں پڑھ رہے تھے لیکن آپ کا من کہیں اور تھا۔ بتائیے آپ اپنی گھوڑی کی بات سوچ رہے تھے نا جس کے ہاں ابھی بچّہ ہوا ہے۔ نواب صاحب کا دل بھی نماز میں



نہیں تھا وہ سوچ رہے تھے کہ ان کے آدمی کابل سے گھوڑے خرید کر ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے؟ ایسی عبادت میں مجھ کو ذرا بھی یقین نہیں ہے۔"

قاضی اور نواب صاحب دونوں دنگ رہ گئے۔ دونوں سوچ رہے تھے کہ نانک نے ان کے دل کی بات کیسے جان لی؟

غریب اور مصیبت زدہ لوگوں کے لیے نانک کے من میں خاص جگہ تھی۔ وہ غریبوں اور مصیبت زدہ لوگوں کے نیتا مانے جانے لگے۔ ایک بار بھائی لالو نام کے ایک بڑھئی نے اپنی جھونپڑی میں نانک کو دعوت دی۔ نانک نے بھائی لالو کے سادہ کھانے کو مزے لے لے کر کھایا۔ اتفاق کی بات تو یہ ہے کہ اسی وقت گاؤں کے چودھری ملک بھاگو نے بھی نانک کو کھانے پر

بلا بھیجا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا کہ کسی امیر کے ہاں دعوت کھائی جائے لیکن نانک نے دعوت میں جانے سے منع کر دیا۔ ملک بھاگو کو بڑا غصہ آیا اور وہ نانک سے جھگڑنے لگا۔ اس نے کہا: "آپ نے ایک غریب کی روکھی سوکھی تو کھالی اور میرے ہاں نہ آکر میری بے عزتی کرتے ہیں۔" نانک نے کہا "اس غریب کی روٹی میں دودھ کے قطرے ہیں اور آپ کی روٹی میں خون کی بوندیں ہیں۔ اس روٹی کو کمانے کے لیے اس نے سخت محنت کی ہے، خون پسینہ ایک کیا ہے تم سیکڑوں غریبوں کا خون چوس کر روٹی کماتے ہو۔" اپنی بات صحیح ثابت کرنے کے لیے نانک نے ملک بھاگو کی روٹی اٹھا کر اُسے نچوڑا تو اس میں سے خون کی بوندیں ٹپکیں۔ لالو کے گھر سے روٹی منگا کر اُسے نچوڑا تو دودھ کے قطرے ٹپکے۔ ملک بھاگو نے



شرم سے سر جھکا لیا۔ ایسی ہی بہت سی کہانیاں نانک کے بارے میں مشہور ہیں۔

یوں ہی گھومتے پھرتے نانک ایک بار ہردوار پہنچے۔ انھوں نے دیکھا کہ گنگا کے کنارے سورج کی طرف منہ کیے ہوئے لوگ اپنے پُرکھوں کا شرادھ کر رہے ہیں، پنڈدان کر رہے ہیں۔ کچھ دیر تو وہ کھڑے دیکھتے رہے پھر گنگا کا پانی لے کر پنجاب کی سمت میں چھڑکنے لگے۔ لوگ ہنسنے لگے۔ نانک نے کہا "اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے۔ میرا گھر پنجاب میں ہے۔ اگر آپ کا چھڑکا ہوا پانی سورگ میں آپ کے پُرکھوں کو مل سکتا ہے تو میرا چھڑکا ہوا پانی پنجاب کیوں نہیں پہنچے گا؟ وہ تو کہیں زیادہ قریب ہے۔"

اسی طرح نانک لوگوں کو سمجھایا کرتے تھے کہ یہ رسم و رواج بیکار ہیں اور وہ لوگوں کو سچے دھرم کا مطلب سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔

پنجاب میں اُن دنوں ایک ڈاکو سجن نامی تھا۔ یہ شخص بہت فطرتی اور ظالم تھا۔ اس نے ہندوؤں کے لیے مندر اور مسلمانوں کے لیے مسجد تعمیر کرائی تھی۔ وہ سوچتا تھا کہ اس طرح ہندو مسلمان اس کے گھر آکر مہمان بنیں گے اور وہ انھیں سوتے میں قتل کر کے ان کا سامان قبضے میں کر لیا کرے گا۔

ایک روز نانک ادھر سے گزر رہے تھے کہ سجن نے انھیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ سجن نے سوچا کہ یہ شخص بہت خوش ہے اس لیے اس کے پاس بہت دولت ہوگی۔ میں اسے قتل کر کے سب کچھ حاصل کر لوں گا اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔

کھانے کے بعد سجن نے زور دیا کہ نانک سو جائیں۔ نانک نے کہا: "کچھ لوگ بظاہر نیک ہوتے ہیں لیکن ان کے دل گناہوں سے بھرے ہوتے ہیں . . . ." سجن نے سمجھ لیا کہ نانک کا اشارہ اس کی ہی طرف ہے، وہ نانک کے قدموں میں گر پڑا اور اپنے گناہوں کا اقرار کر کے معافی کا طلب گار ہوا۔

نانک نے کہا: "سجن، تمھیں صرف خدا ہی معاف کر سکتا ہے اور وہ اسی وقت معاف کرتا ہے، جب لوگ اپنے گناہوں کو کھلے دل سے مان کر اپنی غلطیوں کو درست کرنا شروع کر دیں۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے کتنے آدمیوں کو لوٹا اور قتل کیا ہے؟"

سجن کا سر شرم سے جھک گیا۔ اس نے کہا: "میں نے سیکڑوں مردوں، عورتوں اور بچّوں کو لوٹا اور قتل کیا ہے، بھلا مجھے کس طرح خدا کی معافی مل سکتی ہے۔"

نانک نے کہا: "اپنا سب کچھ غریبوں میں دان کر دو۔"

سجن نے نانک کے کہنے کی تعمیل کی اور سب کچھ تیاگ کر نانک کا چیلا بن گیا۔ ہندوستان میں سب سے پہلا گردوارہ اسی سجن نے بنوایا جو کہ نانک کے لیے اس کا اظہارِ عقیدت ہے۔

دوسرے سنتوں کی طرح نانک بھی ذات پات کے خلاف تھے۔ وہ ریاکاری اور اوہام پرستی کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ انھوں نے تین باتوں پر خاص زور دیا: فرض کی ادائیگی، اپنے اور دوسروں کے لیے احترام کا جذبہ اور خدا کی عبادت۔

نانک تمام عمر جھوٹ اور اوہام پرستی سے لڑتے رہے۔ لوگوں کو دھرم کا صحیح راستہ دکھاتے رہے اور غریب اور لاچار لوگوں کی مدد کرتے رہے۔

1531 کے آشون مہینے میں وہ گھومتے گھامتے کرتارپور پہنچے، وہاں نانک نے اپنی ذمے داریاں ایک مرید انگد کے سپرد کیں۔ 1539 میں دجے دشمی کے دن وہ سُورگ سدھار گئے۔

# بسویشور

بارھویں صدی میں کرناٹک کے بیجاپور میں باگ واڑی نام کا ایک گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں مندگے مدی راج نامی ایک برہمن تقریباً پانچ سو برہمن خاندانوں اور دوسری ذاتوں کے لوگوں کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ گاؤں بطور تحفہ برہمنوں کو دیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں برہمن بہت با اثر زندگی گزار رہے تھے۔ مدی راج بھی اسی گاؤں کا ایک بڑا آدمی تھا جس کی بہت عزت کی جاتی تھی۔

مدی راج کی بیوی کا نام مدامبی تھا اور وہ دونوں بڑے نیک اور ہمدرد تھے لیکن اپنی تمام دولت اور عزت کے باوجود وہ ہمیشہ اداس رہتے تھے کیونکہ ان کے یہاں کوئی بچہ نہیں تھا۔ آخر انھوں نے سادھو سنتوں سے دعا کرانی شروع کی۔ سادھوؤں نے ان سے کہا کہ وہ برت رکھیں اور نندی پر سوار شو کی پوجا کریں۔

مدامبی نے خلوص دل سے برت رکھا اور یہ دعا کی کہ اگر اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو وہ اس کا نام بسو رکھے گی (کنڑ زبان میں بسو بیل کو کہتے ہیں)

آخر اس کی دعائیں قبول ہوئیں اور اس کے ہاں ایک چاند سے بیٹے نے جنم لیا۔

بسو بچپن سے ہی بہت ذہین تھا اور اپنی خداداد ذہانت کی وجہ سے پورے گاؤں کو محبوب تھا۔

اس کا باپ ایک عالم آدمی تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا ویدوں کے ساتھ دوسرے تمام علوم کی تعلیم حاصل کرے۔ اس نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کا انتظام بڑے جوش و خروش سے کیا۔ بسو نے جلد ہی ویدوں کے اشلوک زبانی یاد کر کے

سُنانے شروع کر دیے۔ لیکن بسو کو شروع ہی سے برہمنوں کی اس بات سے نفرت تھی کہ وہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ تھے۔

وہ سانپوں کی پوجا کرتے تھے لیکن اگر ان کے گھر میں کوئی سانپ آجاتا تھا تو وہ اسے مار ڈالتے تھے۔

آگ کو مقدس مانا جاتا تھا لیکن اگر کہیں آگ لگ جاتی تھی تو وہ اسے بجھا دیتے تھے۔ کسی بھی مذہبی تیوہار کے موقعے پر جانوروں کی قربانی بھی اسے پسند نہیں تھی، کیونکہ قربانی سے پہلے جانوروں کی جو چیخ و پکار ہوتی تھی، انھیں وہ پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لیے اس قسم کی باتیں اسے ہمیشہ پریشان رکھتی تھیں۔

جب بسو آٹھ سال کا تھا تو ایک دن اس نے دیکھا کہ گاؤں میں بڑی دھوم دھام ہے۔ عورتیں اپنے گھروں کو سجا رہی ہیں۔ دروازوں پر پھول پتوں کی جھالریں لگا رہی ہیں جگہ جگہ رنگولی سجائی جا رہی ہے۔ پورا گاؤں شہنائی کی آواز سے گونج رہا ہے۔ بڑھیا بڑھیا کپڑے پہنے مرد عورت گھوم رہے ہیں۔ بسو نے اپنے باپ سے اس دھوم دھام کے بارے



میں پوچھا تو انھوں نے ہنس کر کہا: "ارے پگلے، تجھے معلوم نہیں؟ آج تیرا یگنوپاوت ہے۔ آج برہمن تیرے گلے میں مقدس جنیئو پہنائیں گے۔"

بسو نے پوچھا "یگنوپاوت کیا ہوتا ہے؟"

"برہمن اور چھتریوں کے لڑکے جب پڑھنے لکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو ان کا یگنوپاوت کیا جاتا ہے اور انھیں جنیئو پہنایا جاتا ہے۔"

بسو نے پوچھا "صرف برہمن اور چھتری ہی جنیئو کیوں پہنتے ہیں؟ دوسرے کیوں نہیں پہنتے؟"

"نیچ ذات والے نہیں پہنتے۔" باپ نے ذرا بے صبری سے کہا "آؤ اب چلیں۔"

"لیکن اگر میں جنم سے برہمن ہوں تو مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں یہ مقدس دھاگہ

گلے میں ڈالوں۔"

بسو کے باپ نے بہت کوشش کی مگر بسو نے جنیو پہننے سے صاف انکار کردیا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔ میں جنیو پہننا نہیں چاہتا اور میں کسی ایسی تقریب میں شامل نہیں ہوں گا جس کے ذریعے لوگوں میں تفریق پیدا کی جاتی ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ وہ مختلف ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نہیں چلوں گا، اگر آپ دباؤ ڈالیں گے تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

ایک چھوٹے سے لڑکے کے منہ سے ایسی بات سن کر لوگ دنگ رہ گئے۔ باپ کو برا لگا۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ اس نے سمجھایا: "یہ تو بھگوان کی بنائی ہوئی رسمیں ہیں، بیٹا! ان کی تو تعمیل کرنا ہی پڑے گی۔" بات رسم و رواج کی نہیں تھی، عزت کا بھی معاملہ آپڑا تھا۔

پجاریوں نے بھی سمجھایا، مدامبی نے بھی زور ڈالا۔ آخر بسو راضی ہوگیا۔ اس نے یگنوپاوت کی رسم میں حصہ لیا اگرچہ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ آخر کار گرو نے اسے اپنی شاگردی میں قبول کیا۔ اس طرح مدی راج اور مدامبی اپنی ذمے داریوں سے سبک دوش ہوئے۔

بسو نے ویدوں، گرامر، شاعری، موسیقی، ادب، فلسفہ اور دوسرے فنون کا علم حاصل کیا۔ وہ بہت ذہین تھا اور جو کچھ اسے سکھایا جاتا، اس پر بہت جلد عبور حاصل کرلیتا تھا لیکن اسے اس طریقۂ تعلیم سے نفرت تھی جس میں طالب علموں کو بغیر سوچے سمجھے توتوں کی طرح رٹا دیا جاتا تھا۔

بسو جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا سماج میں ہونے والی برائیوں اور ناانصافیوں کے لیے اس کا ضمیر زیادہ باشعور ہوتا گیا۔ اس کے اور پجاریوں کے درمیان اختلافات بڑھتے ہی گئے۔



اس دوران ان کے والدین مرگئے اور جب گاؤں والوں نے ان کی کھلی مخالفت شروع کردی تو بسو نے گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ کڈال سنگم نامی جگہ پر چلے گئے جو دریائے کرشنا اور ملپربھا کے کنارے واقع ہے۔ یہ مقام بھی بیجاپور ضلع میں ہی ہے جس جگہ دونوں دریا ملتے ہیں وہاں سنگمیشور نامی مندر بنا ہوا ہے۔ بسو یہاں برسوں عبادت کرتے رہے۔

وقت گزرتا رہا اور بسو نے دیکھا کہ اس مقدس جگہ بھی ذات پات اور رنگ و نسل کا فرق کیا جاتا ہے یہاں کے لوگ بھی باگ واڑی کے لوگوں سے مختلف نہیں ہیں۔ اس کے باوجود اسے یقین تھا کہ اسے روحانی روشنی اسی جگہ ملے گی۔

آخر اس نے فیصلہ کیا کہ آگے بڑھ کر اپنا پیغام دنیا کے لوگوں تک پہنچائے، اپنے فلسفۂ زندگی کو لوگوں تک پہنچانے سے پہلے اسے اپنے لیے ایک ذریعۂ آمدنی تلاش کرنا تھا اور ایسے لوگوں

کو اپنا چیلا بنانا تھا جو اس کی تن من سے مدد کر سکیں۔

بسو بہت اچھا ریاضی داں تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر اسے راجا بجّل کے خزانے میں کوئی کام مل جائے تو روٹی کا سلسلہ ہو جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ راجا بجّل کے ہاں گیا اور خزانے کے دفتر میں ٹھہر کر افسرِ اعلیٰ کا انتظار کرنے لگا تاکہ اس سے اپنے لیے نوکری مانگ سکے۔ خزانے کے افسرِ اعلیٰ سدھا دندناتھ جلد ہی آگئے اور حساب کتاب چیک کرنے لگے۔ بسو ان کے نزدیک کھڑے رہ کر رجسٹر کو بغور دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک غلطی پر پڑی جس کی وجہ سے ریاست کو بھاری نقصان ہو سکتا تھا۔ جب بسو نے غلطی کی نشاندہی کی تو سدھا دند مارے خوشی کے اچھل پڑے۔

وہ فوراً ہی بسو کو راجا بجّل کے پاس لے گئے اور اس سے بسو کی ذہانت کا تذکرہ کیا۔ ان کے خیال میں خزانے کے کام کے لیے بسو سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا تھا۔ بسو کو ملازم رکھ لیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بعد میں بسو نے سدھا دندناتھ کی دونوں بیٹیوں گنگا دیوی اور مایا دیوی سے شادی کی تھی۔

بسو اگرچہ خود شو کے ماننے والے تھے مگر وہ دوسرے فرقوں کا بھی احترام کرتے تھے۔ سدھا دندناتھ کے بعد وہی خزانے کا افسرِ اعلیٰ بنا۔ اپنے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اپنے عقیدے کو پھیلانے کا کام بھی بسو نے جاری رکھا۔ راجا بجّل کو بسو پر مکمل اعتماد تھا اور اس نے کبھی بسو کے مذہبی کاموں میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔

خزانے کا نظام سنبھالنے سے پہلے ہی بسو نے راجا کو



بتا دیا تھا: "میں شو بھگت ہوں۔ شو کے سب پجاری میرے پاس آیا کریں گے اور میں ان کی مہمان نوازی کیا کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ یہ کہیں کہ میں خزانے کا روپیہ اپنے بھگتوں پر برباد کر رہا ہوں۔" لیکن راجا نے بسو میں اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور کہا: "میں تمھارے بارے میں کسی ایسی بات کا یقین نہیں کروں گا۔"

بسو اپنی کمائی کا پیسہ پیسہ اپنے بھگتوں پر خرچ کر دیتے تھے۔ ان کا گھر ہمیشہ شو بھگتوں سے بھرا رہتا تھا۔ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان لوگوں نے جو بسو سے جلتے تھے، راجا سے شکایت کی کہ بسو خزانے کا روپیہ اپنے عقیدے کو پھیلانے کے لیے خرچ کر رہا ہے۔ راجا نے خزانے کے حساب کی جانچ پڑتال کی تو دیکھا وہاں کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہے بلکہ خزانے کی دولت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

بسو کے چیلوں میں ایک برہمن اور ایک اچھوت تھا۔ برہمن اور شودر چاہتے تھے کہ اپنے بیٹا بیٹی کو ایک دوسرے سے بیاہ دیں۔ بسو کو اس خبر سے بہت خوشی ہوئی اور انھوں نے دعائیں دیں لیکن لوگ اس حقیقت کو کیسے قبول کر سکتے تھے کہ ایک برہمن کا بیٹا ایک اچھوت کی بیٹی سے شادی کرے۔ انھوں نے راجا سے شکایت کی اور راجا نے شادی کو روکنے کا حکم دیا لیکن اس کے باوجود شادی انجام پائی۔ اس بات پر راجا کو بہت غصہ آیا اور اس نے دولہا دولہن کی آنکھیں نکالنے کا حکم دے دیا۔

بسویشور اب ایک اہم مذہبی رہنما تھے اور وہ اپنے گھر میں رہ کر اپنے عقیدے اور مذہب کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ ان کی شہرت اور مقبولیت سے مخالف بے حد خوفزدہ تھے۔ انھوں نے راجا سے ان کی جھوٹی شکایتیں کرنی شروع کیں اور اس شادی والے واقعے کے بعد تو بسو اور راجا کے تعلقات بہت خراب ہو گئے۔ آخر بسو نے راجا کی نوکری چھوڑ دی اور پھر کڈال سنگم میں آکر رہنے لگے اور یہیں 68-1167 میں ان کی موت ہوئی۔

اپنی شوبھکتی کے پرچار کے ساتھ بسو نے عورتوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے بھی بہت کام کیا۔ اپنا پیغام عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے بسو اور ان کے چیلوں نے سادہ کنڑ زبان میں نظمیں لکھیں۔ بیلگام میں ہونے والے کانگریس کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے ایک بار کہا تھا کہ جو کام وہ آج کر رہے ہیں، کرناٹک میں اس کی ابتدا بسویشور نے بارھویں صدی عیسوی میں کر دی تھی۔

## چکردھر

چکردھر سوامی پیدا تو ہوئے تھے گجرات میں لیکن انھوں نے کام مہاراشٹر میں کیا۔ ان کا پیدائشی نام ہرپال دیو تھا لیکن بعد میں وہ چکردھر کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ گجرات کے ایک خوش حال گھرانے سے تھے اور ان کے والد راج پریوار سے متعلق تھے۔

جب ہرپال دیو پچیس برس کے تھے تو دیوگری کے راجا نے گجرات پر حملہ کیا۔ ہرپال دیو کے جسم میں طاقت اور دل میں خودداری تھی۔ انھوں نے بڑی بہادری سے دشمن کا مقابلہ کیا اور انھیں ویرل تک پسپا کر دیا۔ فتح تو ملی لیکن اس دوران ہرپال دیو اچانک بیمار ہو گئے۔ ان کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن وہ بچ نہ سکے۔

اس کے بعد جو کہانی بتائی جاتی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ کہتے ہیں کہ ہرپال دیو کے مردہ جسم کو شمشان لے جا رہے تھے کہ وہ اچانک اٹھ بیٹھے جیسے گہری نیند سے جاگے ہوں۔

لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ ایسی انہونی بات نہ کسی نے دیکھی نہ سُنی تھی۔ لوگوں نے سوچا شاید کوئی بھوت پریت ہے۔ اس کا امتحان لینے کے لیے طرح طرح کے سوالات پوچھے گئے لیکن ہرپال دیو نے سب کے صحیح جواب دیے اور کچھ باتیں تو ایسی بتائیں جو ہرپال دیو اور ان کی بیوی کے علاوہ اور کسی کو معلوم نہ تھیں۔ ہرپال دیو پھر سے زندہ ہو گئے تھے اور لوگ خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔

ایسا واقعہ فوق الفطرت ہی سمجھا جا سکتا تھا۔ گجرات میں لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ چندر دیو راول کے جسم میں دواپر یگ[1] کے کسی دیوتا نے جنم لیا ہے۔ اس لیے لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہرپال دیو کے بدن میں چندر دیو راول کی آتما ہے۔ اب لوگ ہرپال دیو کو چکر دھر کہنے لگے۔

چکر دھر کی ابتدائی زندگی بہت سادہ تھی۔ وہ ہنس مکھ اور ہمیشہ خوش رہنے والا آدمی تھا۔ اس نے ایک خوبصورت عورت سے شادی کی اور ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔ تب ہی انھیں جوا کھیلنے کی لت پڑ گئی اور رفتہ رفتہ وہ اپنا سب کچھ جوے میں ہار گئے تھے۔ جتنا وہ ہارتے تھے اتنے ہی جوش سے کھیلتے تھے، اس امید پر کہ شاید کسی دن داؤ لگ جائے اور کھوئی ہوئی دولت پھر واپس مل جائے۔ قرض بڑھتا گیا، یہاں تک کہ وہ ساری پونجی گنوا بیٹھے لیکن انھوں نے گھر والی کو اس بات کا پتا نہ لگنے دیا۔ آخر قرض داروں نے انھیں پریشان کرنا شروع کیا تب گھر میں ساری باتیں بتانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ چکر دھر لاچار ہو کر گھر آئے اور اپنی بیوی کو ساری بات بتا کر کہا: "مجھے اپنے زیور دے دو

---

[1] ہندو دیومالا میں زمانے کو چار یگوں میں بانٹا گیا ہے: (۱) ست یگ (۲) ترتیا یگ (۳) دواپر یگ (۴) کل یگ۔ دواپر یگ میں شری کرشن کا جنم ہوا تھا۔ آج کے زمانے کو کل یگ کہتے ہیں۔

تو قرض چکا کر اپنی جان بچاؤں"۔ ان کی باتیں سُن کر بیوی کو بہت دُکھ ہوا۔ اس نے ان کو بہت بُرا بھلا کہا اور زیور دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا: "زیور میرے ماں باپ نے مجھ کو دیے تھے۔ انھیں میں ہرگز نہیں دوں گی"۔ بیوی کی باتیں سن کر چکر دھر کی آنکھیں کھلیں۔ انھوں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ مصیبت کے وقت بیوی بھی مدد کرنے سے انکار کر دے گی۔ چکر دھر کا دل گھر پریوار سے اچاٹ ہو گیا اور وہ تیرتھ یاترا پر نکل پڑے اور گھومتے پھرتے مہاراشٹر کے مشرقی حصّے میں درہاڈ پہنچے، جہاں ان کی ملاقات ایک سنت گووند پربھو سے ہوئی۔ چکر دھر ان کے چیلے بن گئے۔

گرو کا آشیرواد لے کر تپسیا کرنے کے لیے چکر دھر جنگل میں چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سلبارڈی کے جنگل میں بارہ برس تک تپسیا کی۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ اُن دنوں وہ کیسے رہتے تھے، کیا کھاتے تھے اور ان کے روزمرہ کے معمولات کیا تھے۔ ہمیں بس اتنا ہی معلوم ہے کہ بارہ برس غائب رہنے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے شہر کانتی میں نظر آئے۔

تپسیا پوری ہو گئی تو چکر دھر کی ملاقات اُدھلی ناتھ سے ہوئی جو ایک بڑے عالم اور پہنچے ہوئے بزرگ کہے جاتے تھے۔ انھوں نے چکر دھر کو اپنا سارا علم سکھانا چاہا لیکن انھوں نے دیکھا کہ وہ بذاتِ خود اتنے پہنچے ہوئے ہیں کہ ان کے سکھانے کے لائق کوئی خاص علم ان کے پاس نہیں ہے۔ چکر دھر کا سراپا بہت باوقار تھا۔ ان کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اُدھلی ناتھ نے انھیں ہمیشہ جوان رہنے کا راز بتا دیا کہ اس سے انسان کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ چکر دھر بھی آخر تک جوان رہے۔

چکر دھر کا یقین تھا کہ ایشور کو پانا ہے تو دنیا کے آرام اور خوشیوں کو تیاگ کر سنیاسیوں کی طرح رہنا ہوگا۔ انھوں نے "مہانو بھاؤ پنتھ" چلایا اور بہت سے لوگ ان کے چیلے بن گئے۔
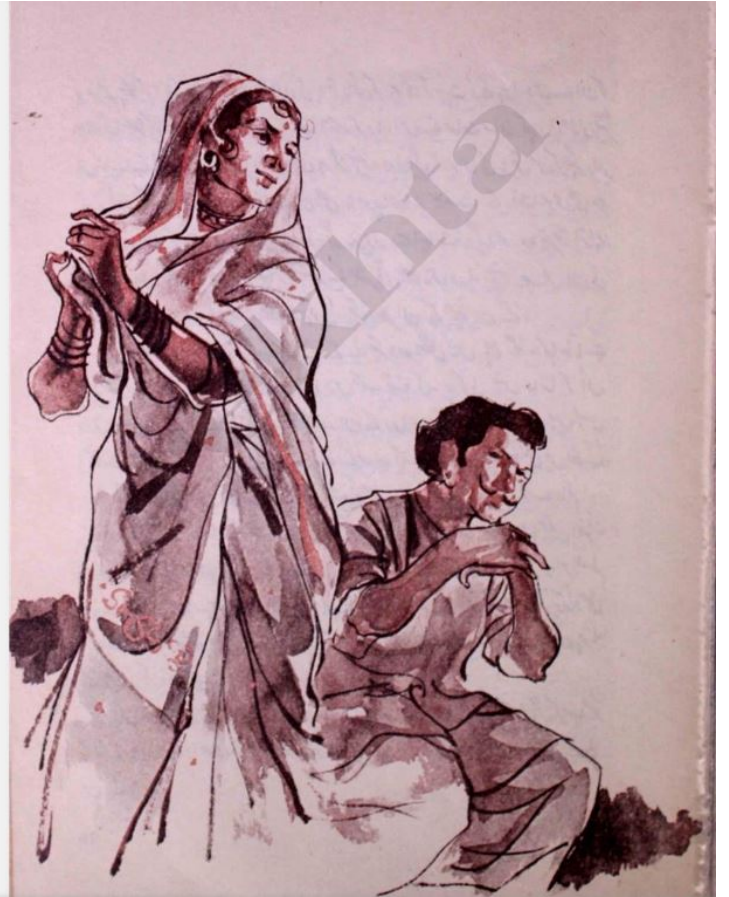
اس زمانے میں دھرم اور گیان مکمل طور سے برہمنوں اور اونچی ذات کے لوگوں کے ہاتھ بس تھا۔ اونچی ذات کے مغرور لوگ انھیں جو دو چار چھوٹی موٹی باتیں بتاتے تھے اسی پر عام لوگوں کو اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ چکر دھر نے اس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی اور انھوں نے اپنے سارے اُپدیش عوام کی زبان مراٹھی میں دیے تاکہ سب لوگ انھیں سمجھ سکیں۔ ان کے اُپدیش مراٹھی زبان و ادب میں زبردست اضافہ ہیں۔ اگرچہ اونچی ذات والوں نے انھیں بہت ستایا پھر بھی عام لوگ چکر دھر کے اُپدیش سننے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں آتے تھے۔ اپنے دھرم کو پھیلانے کے لیے چکر دھر نے دور دور تک سفر کیے۔ لوگ بتدریج ان کے اُپدیش پر عمل کرنے لگے اور "مہانو بھاؤ پنتھ" بھی بڑھتا چلا گیا۔

لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے، جیسے جیسے چکر دھر سوامی مقبول اور مشہور ہونے لگے، ان کے مخالفوں اور دشمنوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ لیکن وہ اپنے دشمنوں کا کبھی بُرا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ وہ اپنے خیال اور عمل دونوں میں اہنسا وادی تھے۔ ایک بار کسی نے دھوکے سے انھیں زہر دے دیا۔ انھوں نے چُپ چاپ تکلیف سہہ لی اور زہر دینے والے سے کوئی شکایت نہ کی۔

چکر دھر کو کتنے ہی پرانے رسم و رواج ناپسند تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ اس زمانے کے لوگ قدامت پسند اور اوہام پرست تھے۔ اس کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت تھی۔ چکر دھر ذات پات کے خلاف تھے۔ یگیہ وغیرہ پر انھیں یقین نہ تھا۔ مکتی کے لیے تیرتھ یاترا کرنا وہ ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ بھگوان ہر جگہ موجود ہے۔ اسی لیے اس بات کو وہ نہیں مانتے تھے کہ تیرتھ یاترا کے بغیر کسی کی مکتی نہیں ہو سکتی۔



کاکوس نامی ان کا ایک چیلا تھا۔ کچھ لوگ جب تیرتھ یاترا پر جانے لگے تو اس کی بھی خواہش ہوئی کہ ان لوگوں کے ساتھ دوارکا کی یاترا کرے۔ چکر دھر سوامی نے اسے بہت سمجھایا کہ اپنا شریر ہی بھگوان کا مندر ہے۔ بھگوان کے درشن کے لیے دوسری جگہ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن کاکوس میں اتنی سمجھ کہاں؟ اس نے ضد کی تب چکر دھر سوامی نے اسے سبق سکھایا۔ شاگرد جب آنکھیں بند کیے "دھیان" میں بیٹھا تھا تب اُسے اپنے سامنے دوارکا نگری دکھائی دینے لگی۔ اس نے دیکھا کہ راجدوت اسے ایک عظیم الشان محل میں لے جا رہے ہیں۔ اندر جاکر اس نے بھگوان کرشن کو تخت پر بیٹھے دیکھا۔ وہ بہت ہی خوش ہوا لیکن آہستہ آہستہ شری کرشن بھگوان کی جگہ پر چکر دھر سوامی نظر آنے لگے۔ تب اسے عقل آئی کہ بھگوان گرو کی شکل میں پاس ہی موجود ہیں تو خواہ مخواہ تیرتھ یاترا کر کے جسم کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے؟

اس طرح خود کو مثال بنا کر چکر دھر سوامی لوگوں کو دھرم کا صحیح مطلب سمجھایا کرتے تھے۔ انھوں نے لوگوں کو بتایا کہ بے معنی رسم و رواج کا ماننا ہی دھرم نہیں ہے۔ ان کی اصلاحی باتوں سے قدامت پسند لوگ چڑتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ چکر دھر سوامی کے اتنے خلاف ہو گئے کہ انھوں نے راجا کے بھی کان بھر دیے۔ اب چکر دھر سوامی کو ستانے کی سازش میں سرکاری طاقت بھی شامل ہو گئی۔

"مہالیہ" کے مندر میں سارے کٹر برہمن اکٹھے ہوئے۔ انھوں نے چکر دھر سوامی کو بلا کر صفائی مانگی۔ چکر دھر ایسے بد دماغ لوگوں سے انصاف کی کیا توقع کر سکتے تھے؟

پوچھ تاچھ کا ناٹک کر کے چکر دھر سوامی کو ناک کان کاٹنے کی سزا دی گئی۔ فوراً ہی اس پر عمل کیا گیا۔

چکر دھر تین دن تک قید میں رہے، چوتھے دن جب وہ باہر آئے تو ایک معجزہ ہوا۔ ان کا چہرہ پہلے کی طرح ہی خوب صورت تھا۔ ناک کان کٹنے کا نشان بھی نہ تھا۔ ان کے چیلے خوشی سے پھولے نہ سمائے ہزاروں لوگوں کی بھیڑ خوش ہو کر نعرے لگانے لگی لیکن

ان کے مخالفوں کے غصے کی حد نہ رہی۔ انھوں نے سوچا اب راجا سے سزا دلوا کر اس مصیبت کو جڑ سے ختم کر دیا جائے۔

چکر دھر سوامی کو ان کے مٹھ سے باہر گھسیٹا گیا۔ ان کے چیلے ناگ دیو نے انھیں بچانے کی کوشش کی تو سپاہیوں نے اُسے ڈنڈوں سے پیٹ کر دور بھگا دیا۔ پل بھر کی تاخیر کیے بنا اس نیک اور رحم دل چکر دھر سوامی کا سر کاٹ دیا گیا۔ ندی کا کنارا تھا وہیں ایک بیراگی اس کٹے ہوئے جسم کو دیکھ رہا تھا کہ ایک اور چمتکار ہوا۔ سر آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگا اور بڑھ کر جسم سے جڑ گیا۔ چکر دھر پھر زندہ ہو گئے۔

لیکن چکر دھر کو اب وہاں رہنا منظور نہ تھا۔ انھوں نے لوگوں کو علم کی روشنی دینے کی کوشش کی لیکن لوگوں نے جہالت کے اندھیرے میں ہی رہنا پسند کیا۔ چکر دھر سوامی ہمالیہ کی طرف چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے دُکھ اور پاپ ختم کرنے کے لیے وہ ابھی تک وہاں موجود ہیں۔

چکر دھر کو تیرھویں صدی کا گاندھی کہا جاتا ہے۔ وہ گجرات میں پیدا ہوئے، مہاراشٹر میں کام کیا، اہنسا کی تبلیغ کی اور آخر میں گاندھی جی کی طرح ہی ان کا بھی قتل سچائی، نیکی اور بھلائی کے دشمنوں نے کیا۔

# ایکناتھ

"ایکناتھ کے گھر کے سارے کام کاج مادھو کرتا ہے۔ چندن گھستا ہے، گنگا سے گھڑے بھر بھر کر پانی لاتا ہے۔" یہ الفاظ ایک مشہور نظم کے ہیں۔

ایکناتھ جس کے گھر میں اس نظم کے مطابق خود مادھو یعنی بھگوان سارے کام کرتے تھے، 1528 میں پیٹھن میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ مشہور سنت بھانوداس کے پوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب وٹھل کی مورتی کو اٹھا کر کرناٹک لے جایا گیا تھا تو بھانوداس اپنی ریاضت کے بل بوتے پر اسے واپس پندھارپور لے آئے تھے۔

ایکناتھ کو گھر میں "ایکیہ" کہا جاتا تھا جس کا مطلب ہے 'ایک'، کیونکہ بھانوداس کے خاندان میں وہ اکلوتے لڑکے تھے۔

بچپن ہی سے ایکناتھ بہت ذہین تھے۔ انھوں نے جلد ہی سنسکرت کے اشلوک اور پوجا کے منتر وغیرہ سیکھ لیے اور وہ چھ ہی سال کے تھے کہ انھیں جنیؤ پہنا دیا گیا۔

بچپن ہی سے ایکناتھ بھگوان کے بھگت تھے۔ چھوٹے چھوٹے گول کنکروں کو ہی ہری کی مورتی مان کر وہ پھولوں سے ان کی پوجا کیا کرتے تھے۔ رسوئی سے کڑھی اٹھا لیتے اور اسے کاندھے پر لیے گھومتے، کہتے یہ میری وینا ہے۔ توتلی زبان میں پد گاتے۔ کہیں کوئی بھجن کیرتن سن لیتے تو اس کی ہو بہو نقل اتارتے۔ کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی جھنڈی بنا کر کاندھے پر تان لیتے اور کہتے ہیں پندھارپور جا رہا ہوں۔ بالک ایکناتھ کے کھیل ایسے ہی غیر معمولی ہوتے تھے۔



ان کے یہ اطوار دیکھ کر ایکناتھ کے پتا نے انھیں کسی بڑے گرو کے پاس تعلیم کے لیے بھیجنے کا فیصلہ کیا جیسا گرو وہ چاہتے تھے خوش قسمتی سے جلد ہی ویسا گرو مل گیا۔ گرو کا نام تھا جناردن سوامی۔ ایکناتھ نے اپنی نظموں میں اپنے گرو کا ذکر بار بار کیا ہے۔

جناردن سوامی کا تعلق چالیس گاؤں کے بجاریوں کے خاندان سے تھا۔ وہ ایک سمجھ دار سیاستداں تھے جو بعد میں دولت آباد میں سرکاری عہدہ پر فائز ہوئے۔ بے حد مذہبی ہونے کے باوجود وہ بڑی لگن سے اپنا کام کرتے تھے اور گھریلو ذمے داریاں بھی اچھی طرح نباہتے تھے۔

ایکناتھ جب جناردن سوامی کے پاس گئے تو انھوں نے فوراً ہی سمجھ لیا کہ وہ کوئی معمولی بچہ نہیں ہے۔ انھوں نے اسے آشیرواد دے کر اپنا شاگرد بنا لیا۔ جناردن سوامی بڑی دلچسپی سے پڑھانے لگے
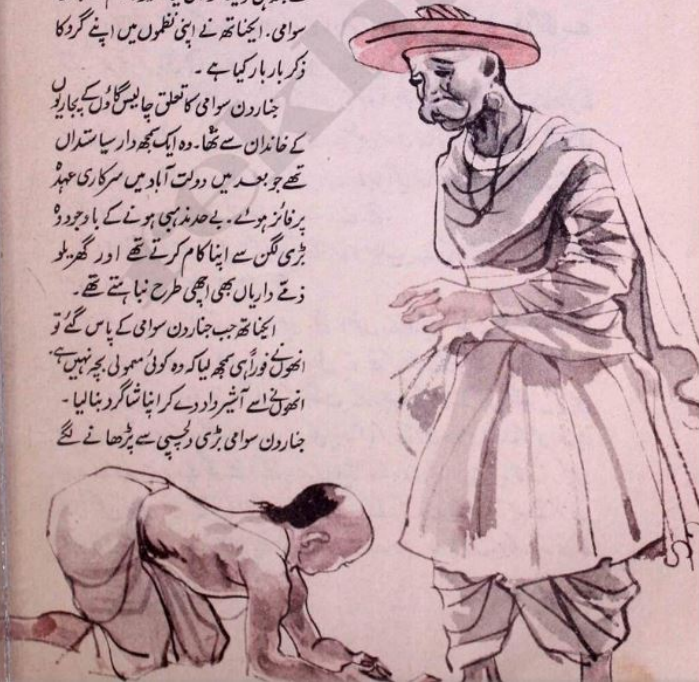
کیونکہ اپنا سارا علم وہ ایکناتھ کو دے دینا چاہتے تھے۔ ایکناتھ بھی بڑی عقیدت سے اپنے گرو کی خدمت میں رہتے تھے۔

ایک روز آدھی رات کو گرو دیو کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایکناتھ پریشان سا کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔ حساب کے سارے کھاتے اس کے سامنے کھلے رکھے تھے۔ اچانک وہ مسکرا کر تالیاں بجانے لگا۔

"کیا بات ہے ایکناتھ؟" گرو نے پوچھا "آدھی رات کو یہ کیا کر رہے ہو؟ سوئے کیوں نہیں؟"

ایکناتھ نے جواب دیا: "گرو دیو ایک پیسے کا حساب نہیں مل رہا تھا اسی سے پریشان تھا۔ اتنی دیر کے بعد اب جاکر مجھ کو پتہ چلا کہ غلطی کہاں پر تھی۔ اس لیے میں خوش ہو رہا تھا۔"

جناردن سوامی نے مسکرا کر کہا "ایکناتھ! اگر اتنی یکسوئی سے بھگوان کی عبادت کروگے تو زیادہ مزا آئے گا۔"

ایکناتھ امن و آشتی کا مجسمہ تھے۔ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کے مالک تھے۔ غصہ پر تو انھوں نے پوری طرح قابو پالیا تھا۔ ایک بار وہ گنگا میں اشنان کے لیے گئے۔ اشنان کرکے نکلے ہی تھے کہ ایک شخص نے ان پر تھوک دیا۔ اس کو بنا کچھ کہے دوبارہ اشنان کرنے چلے گئے لیکن جیسے ہی وہ باہر نکلے اس شخص نے پھر ان پر تھوک دیا۔ ایکناتھ پھر نہانے چلے گئے۔ اس طرح ایک سو آٹھ بار یہ حادثہ ہوا لیکن ایکناتھ کو ذرا بھی غصہ نہیں آیا۔ آخر وہ آدمی ایکناتھ کے قدموں میں گر پڑا اور بولا "پربھو آپ کی بہت تعریف سنی تھی آج آزما کر دیکھ لیا۔ اب ان چرنوں کو چھوڑ کر میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

ایکناتھ ذات پات کو بالکل نہیں مانتے تھے۔ ایک بار ایک سوکھی سی ندی کے کنارے تپتے ہوئے ریت پر ماہر ذات کے اچھوت کا ایک بچہ پڑا رو رہا تھا۔ ایکناتھ نے فوراً اسے اٹھا لیا اور اس کے ماں باپ کو جاکر سونپ دیا۔ اس وقت وہ اشنان کرکے صاف ستھرے ریشمی کپڑے پہنے عبادت کرنے جا رہے تھے۔

اسی گاؤں میں رانو نام کا ایک بھنگی بھی رہتا تھا۔ وہ بڑا ہی دھرماتما تھا۔ نہ کبھی وہ گالی گلوچ کرتا، نہ شراب پیتا اور نہ گوشت کھاتا تھا۔ اس کی برادری کے لوگوں نے مذاق میں اس کا نام رانو پنڈت رکھ چھوڑا تھا۔ رانو کی بڑی خواہش تھی کہ ایکناتھ ایک بار اس کے گھر کھانا کھالیں۔ ایکناتھ مان گئے۔ رانو کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اُس زمانے میں ایک برہمن کا ایک اچھوت کے گھر کھانے کی دعوت قبول کرنا ایک انہونی بات تھی۔ برہمن لوگ تو اچھوتوں کے سائے سے بھی کتراتے تھے اور یہاں ایکناتھ اچھوت کے گھر کھانے کو تیار ہو گئے تھے۔

ماہر اچھوتوں کی آبادی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر ایک نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اپنے گھر کو سجایا۔ رانو نے تو اپنا گھر اس طرح سجایا تھا جیسے دیوالی کا تیوہار ہو۔ چاروں طرف آم کے پتوں کی جھالریں لٹکائیں اور باہر دیوار پر کیلے کے تنے باندھے۔ آنگن کو گوبر کے پانی سے لیپ پوت کر خوب سجایا۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ قطار باندھ کر ایکناتھ کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی ایکناتھ آئے لوگوں نے نعرے لگائے۔ رانو نے بڑی عقیدت سے کھانا پیش کیا۔ کھانا بالکل سادا تھا لیکن ایکناتھ نے اسے امرت کی طرح کھایا۔ رانو اور اس کی برادری کے لوگ اتنے خوش تھے جیسے بذات خود بھگوان ان کے گھر پدھارے ہوں۔ اس روز ماہر بستی جیسے سورگ بن گئی تھی۔

ایکناتھ کے گھر میں ایک مرتبہ چور گھس آئے۔ چوروں کا خیال تھا کہ ایکناتھ بڑے پیسے والے ہیں، اس لیے وہ بڑی بڑی امیدیں لے کر آئے تھے۔ جو کچھ زیور وغیرہ ہاتھ لگے وہ ان کی پوٹلی باندھنے لگے۔ اتنے میں ایکناتھ کی اور ان کی بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ چوروں کو دیکھ لیا لیکن انھوں نے نہ شور

مچایا نہ چوروں کو بھگانے کی کوشش کی بلکہ ایکناتھ نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر ان کی جانب پھینک دی۔ انگوٹھی کے گرنے سے گھبرا کر چوروں نے مڑ کر دیکھا تو ایکناتھ کو بیٹھے پایا۔ وہ بڑے شرمندہ ہوئے اور ان کے پیروں پر گر پڑے۔ انھوں نے قسم کھائی کہ کبھی چوری نہیں کریں گے۔ ایکناتھ کی پتنی گرجابائی نے اٹھ کر ان لوگوں کے لیے پوری ترکاری بنائی اور ان کی خوب خاطر کی۔

اس زمانے میں ایک بڑھیا تھی جو بھیک مانگ کر اپنا پیٹ بھرتی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ خواہش کی کہ وہ ہزار لوگوں کو اپنے گھر بلا کر کھلائے۔ اسے ناممکن سمجھ کر کچھ لوگوں نے اس کی بات ٹال دی، کچھ نے مذاق اڑایا۔ ایک برہمن نے رائے دی "کسی ایک اچھے برہمن کو بلا کر کھلاؤ جو صوفی منش
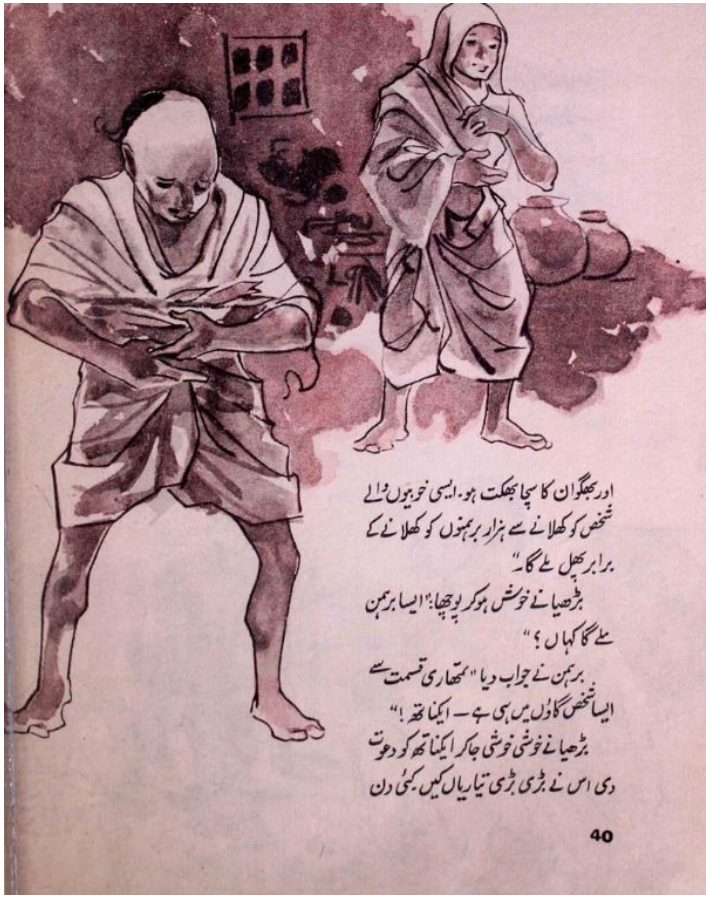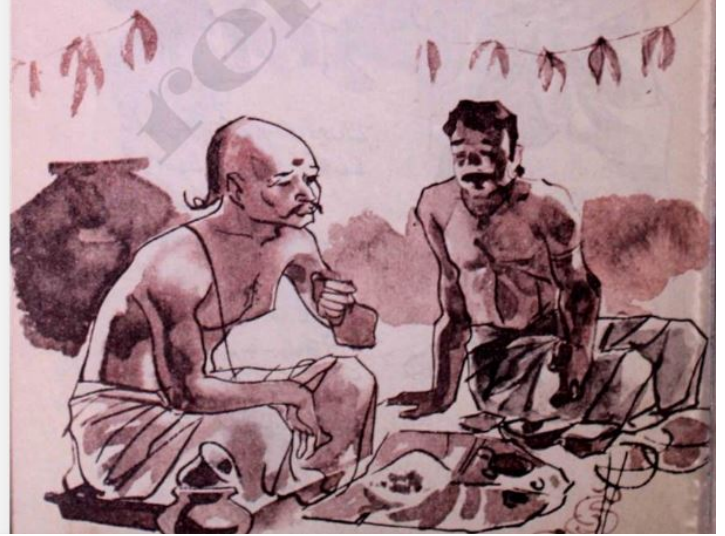
اور بھگوان کا سچا بھکت ہو۔ ایسی خوبیوں والے شخص کو کھلانے سے ہزار برہمنوں کو کھلانے کے برابر پھل ملے گا۔"

بڑھیا نے خوش ہو کر پوچھا: "ایسا برہمن ملے گا کہاں ؟"

برہمن نے جواب دیا "تمھاری قسمت سے ایسا شخص گاؤں میں ہی ہے — ایکناتھ !"

بڑھیا نے خوشی خوشی جا کر ایکناتھ کو دعوت دی اس نے بڑی بڑی تیاریاں کیں۔ کئی دن

پہلے سے ہی بھاگ دوڑ کرتی رہی۔ ایکناتھ کا بیٹا ہری پنڈت بڑا ہی کٹر برہمن تھا۔ انھیں باپ کا بڑھیا کے ہاں جانا اچھا نہیں لگا۔ وہ باپ کے پیچھے پیچھے گئے۔ ایکناتھ نے بڑے مزے سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد انھوں نے اپنے بیٹے سے جھوٹی پتتل اٹھانے کے لیے کہا۔ ہری پنڈت نے تعمیل حکم کی لیکن یہ کیا اس پتتل کے نیچے تو ایک اور جھوٹی پتتل تھی۔ ہری پنڈت نے اس کو اُٹھایا تو اس کے نیچے ایک اور پتتل نکلی۔ اس طرح پوری ایک ہزار پتتلیں نکلیں۔ بڑھیا خوشی سے پھولی نہ سمائی۔

ہری پنڈت اب پچھتائے اور باپ کے چرنوں میں گر کر بولے: "آپ برہمو کے اوتار ہیں، مجھے معاف کریں۔" اس دن سے ہری پنڈت بالکل ہی بدل گئے۔ اب وہ بھی ذات پات کو نہیں مانتے تھے اور ہر انسان کی عزت کرتے تھے۔

ایک بار ہری پنڈت ایک کلسا بھر کر گنگا جل کاشی سے رامیشورم لے جا رہے تھے۔ کاشی سے گنگا جل لے جا کر رامیشورم میں چڑھانا بہت بڑا نیک عمل مانا جاتا تھا۔ ہری پنڈت راستے میں پیٹھن میں ٹھہر گئے۔ گاؤں کے بھی لوگ ان کے استقبال کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ایکناتھ بھی تھے۔ دوپہر کا وقت تھا اور گرمی بہت سخت تھی۔ قریب ہی ایک گدھا پڑا تھا۔ پیاس کے مارے اُس کی

جان نکل رہی تھی۔ ایکناتھ کو بے چارے گدھے پر ترس آیا اور انھوں نے تھوڑا سا گنگا جل لے کر اُس کے منہ میں ڈال دیا۔ ہری پنڈت کو غصہ تو بہت آیا لیکن باپ سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ مقدس گنگا جل کو گدھے کے منہ میں ڈال کر ان کے باپ نے بڑا پاپ کیا تھا۔ یہ تو گنگا جل کا اپمان تھا۔ کتنا مشکل سفر کر کے کتنی دور سے وہ گنگا جل لائے تھے۔ بیچارے ہری پنڈت رات بھر سو نہیں سکے اور گنگا جل کی بات ہی سوچتے رہے۔ کروٹ بدلتے بدلتے جب ہری پنڈت کو کسی طرح نیند نہ آئی تو خواب میں خود رامیشور نے درشن دیے وہ کہہ رہے تھے: "تم مجھ کو ہزار گھڑے گنگا جل سے اشنان

کرواتے تو بھی اتنا پُن (ثواب) نہ ملتا جتنا ایکناتھ کے پیاسے گدھے کو پانی پلانے کی وجہ سے ملا ہے۔"

ایکناتھ کو ہر جاندار اور ہر شے میں بھگوان نظر آتے تھے۔ انسان انسان میں تو کیا وہ تو انسان اور جانور میں بھی کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔

سنت گیانیشور کی کتاب گیانیشوری کو ایکناتھ نے آسان مراٹھی میں ترجمہ کیا۔ سنت ہونے کے علاوہ ایکناتھ بڑے قلمکار بھی تھے۔ انھوں نے سنسکرت کے مہان گرنتھوں کا آسان مراٹھی میں ترجمہ کیا تاکہ عام لوگ انھیں پڑھ اور سمجھ سکیں۔ دھرم اور سماج کو سدھارنے میں انھوں نے جیسی ہمت دکھائی تھی وہ ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ اسی باعث وہ سارے دیش میں مشہور ہو گئے۔ ایک گاؤں، شہر یا صوبہ کے نہ رہ کر سارے دیش کے ہو گئے۔ کاشی میں ان کی کتابوں کا شاندار جلوس نکالا گیا۔ "بھاوارتھ رامائن" اور "رکمنی سوئمبر" ان کی دو مشہور کتابیں ہیں۔

رام اور کرشن دیش بھر کے چہیتے دیوتا ہیں وہ ساری اچھائی، خوبصورتی، بھلائی اور بہادری وغیرہ کی مورتی مانے جاتے ہیں۔ بالمیکی کی رامائن کی بنیاد پر رام کی کہانی لکھنے کی پہلی کوشش ایکناتھ نے ہی کی تھی۔ ان کا اندازِ بیان اتنا دلچسپ اور اتنا دل کش تھا کہ یہ کہانی جلد ہی مقبول ہو گئی۔ رکمنی سوئمبر سے ایکناتھ کی کرشن بھکتی کا پتہ چلتا ہے۔

بھکتی وادادب میں ایکناتھ کی نظموں کا بہت اونچا مقام ہے۔ ان کے ابھنگوں میں عالمی کشش ہے۔ ہر وقت اور ہر جگہ ان کے گیت لوگ زبانی یاد کرتے اور گاتے ہیں۔ ایکناتھ نے گوالنوں کے گیت بھی لکھے ہیں جو آج بھی بہت مقبول ہیں۔ ایکناتھ اپنی نظمیں ہندی میں لکھتے تھے لیکن وہ اُردو پڑھنا اور لکھنا بھی جانتے تھے۔

ایکناتھ کا کہنا تھا کہ ایشور کی بھکتی میں غرض نہیں ہونی چاہیے۔ سیدھے سچے من سے بھگوان کی عبادت کرنی چاہیے۔ "دھیان" کرنے کے لیے جنگل میں جانے کی بھی ضرورت نہیں۔ سب سے بڑی



بات یہ ہے کہ خدمتِ خلق ہی خدا کی خدمت ہے۔ ایکناتھ اس عبادت میں یقین نہیں رکھتے تھے جو ذاتی مقصد کے حصول کے لیے کی جاتی ہو۔

ایکناتھ کی زندگی کے آخری دن تھے۔ وہ بھاوارتھ رامائن کے 44 ادھیائے لکھ چکے تھے۔ انھوں نے جب اپنے ساتھیوں اور شاگردوں کو بتایا کہ ان کی موت قریب ہے تو انھیں بڑا دکھ ہوا۔ انھوں نے کہا "بھاوارتھ رامائن کو پورا کر کے جائیے۔" ایکناتھ نے جواب دیا: "یہ کام گاؤبا پورا کرے گا۔"

گاؤبا کے دماغ کی ابھی پوری طرح نشو و نما بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک سے بول بھی نہ پاتا تھا۔ وہ ایکناتھ کے ساتھ رہتا اور پرانوں کی کہانیاں اور بھجن سنا کرتا۔ سارے ماحول پر بھکتی طاری تھی۔ گاؤبا آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ وہ اشلوکوں کا پاٹھ کرنے لگا۔ سادھو سنتوں کی صحبت بھی اسے اچھی لگنے لگی۔ ایکناتھ کی محنت اور کوشش سے گاؤبا ہوشیار اور لائق آدمی بن گیا۔ اسی نے "بھاوارتھ رامائن" کے باقی ادھیائے لکھ کر اس کو پورا کیا۔

ماگھ مہینے کی چھٹی تاریخ کو گوداوری ندی کے کنارے اشنان کے لیے آئے لوگوں کی بھیڑ لگی تھی وہ ایک بڑا اہم دن تھا۔ جگہ جگہ بھجن کیرتن ہو رہے تھے۔ ایکناتھ بھیڑ کی آنکھ بچا کر چپ چاپ نکلے اور گوداوری ندی میں گھس کر روپوش ہو گئے اور پھر انھیں کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ ان کی کتابیں ان کے لکھے گیت اور نظمیں آج بھی زندہ ہیں۔

# چنڈی داس

بول پور سے چند میل کے فاصلے پر مشرق میں ایک گاؤں نتور نامی ہے۔ تقریباً چار سو برس پہلے ایک برہمن کنبہ اس گاؤں میں رہتا تھا۔ یہ برہمن بشولی کے مندر کا پجاری تھا۔ اس برہمن کے بڑے لڑکے کا نام چنڈی داس تھا۔ چنڈی داس توانا، وجیہہ اور باوقار تھا۔ جو بھی اسے دیکھتا تھا، بس دیکھتا رہ جاتا تھا لیکن چنڈی داس ہمیشہ اپنی عجوبہ اور تصوراتی دنیا میں گم رہتا تھا۔ اسے مخطوطات پڑھنے یا منتر یاد کرنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مسلسل کئی بار کوششیں کرنے کے بعد بیچارے برہمن نے ہمت ہار دی کیونکہ وہ اپنے بیٹے کو دنیاوی تعلیم کی طرف راغب نہیں کر سکا تھا۔

"آج اسے کھانا مت دینا۔" اس نے اپنی بیوی سے ایک روز غصے میں کہا: "بلکہ اس کی تھالی میں کچھ راکھ دھول ڈال دینا۔"

لیکن اس کی ماں ایسا نہ کر سکی۔ اس نے اسے کھانے کو چاول دیے مگر تھالی کے ایک کونے میں تھوڑی سی راکھ بھی رکھ دی کیونکہ وہ اپنے شوہر کی حکم عدولی نہیں کر سکتی تھی۔

"یہ راکھ کس لیے ہے؟" چنڈی داس نے کھانا شروع کرتے ہوئے پوچھا تب اس کی ماں نے بتایا کہ اس کے باپ نے کیا حکم دیا ہے۔ چنڈی داس نے کھانا چھوڑ دیا۔ وہ بہت اداس ہو گیا۔ گاؤں کے باہر بشولی دیوی کا مندر تھا۔ اجے ندی اس کے پاس سے ہی گزرتی تھی جہاں سے وہ مشرق کی سمت بہہ کر گنگا میں مل جاتی تھی۔ وہ ایسی پُرفضا جگہ تھی کہ ہر کہیں دیوی کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔

دکھی دل چنڈی داس مندر کے قریب ہی ایک جگہ بیٹھ گیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ بس



ہوا کی سائیں سائیں تھی جس سے بالکل درخت ہل رہے تھے۔ پانی کے بہنے کی آواز نے چنڈی داس کے دل کی اُداسی کو اور بڑھا دیا تھا۔

"کیا میرے لیے زندہ رہنا ضروری ہے؟" وہ من ہی من میں سوچ رہا تھا کہ اچانک دیوی کی آواز گونجنے لگی؛ "چنڈی داس! ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں۔ تمھیں ایک بہت بڑا شاعر، عالم اور صوفی بننا ہے۔ لوگ تم سے محبت کریں گے کیونکہ تم انسانیت کے گیت گاؤ گے۔"

چنڈی داس گھر واپس لوٹ آیا۔ اس کے گاؤں کے راستے میں پام کے درختوں کا ایک باغ تھا۔ جس میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا تھا۔ اس وقت اس جھونپڑے کے دروازے پر ایک خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔ چنڈی داس اپنے خیالوں میں کھویا چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر اس لڑکی پر پڑی اور وہ حیرت سے اس کو دیکھتا رہ گیا۔ وہ بہت خوبصورت تھی، اتنی خوبصورت بس کرشن کی رادھا ہی ہو سکتی تھی لیکن یہ لڑکی ایک دھوبی کی بیٹی تھی۔ اس کا نام تارا تھا۔ چنڈی داس نے گھر پہنچ کر سب سے پہلے جو نظم لکھی اُسے تارا کے ہی نام سے منسوب کیا۔

ان گنت کہانیاں چنڈی داس کی زندگی کے بارے میں کہی جاتی ہیں۔ برہمن اور پنڈت ان سے اتفاق نہیں کرتے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ چنڈی داس چھٹنا ضلع میں بنکورا کا رہنے والا تھا۔ اس کی موت کے بارے میں بھی بہت سی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک کہانی کے مطابق اسے گوڑ کے سلطان نے ہاتھی کے پیر سے کچلوا دیا تھا اور اسے جب ہاتھی کی کمر سے نیچے پھینکا گیا اس وقت بھی اس نے تارا کی تعریف میں ایک گیت گایا تھا۔

تارا ایک دھوبی کی لڑکی تھی اس کے چھونے سے پینے کا پانی گندا ہو جاتا تھا لیکن چنڈی داس کے لیے ذات پات کی کوئی قید نہیں تھی۔ اس کے لیے وہ تخلیقی قوت کا ایک ذریعہ تھی، بالکل ایسے جیسے رادھا، کرشن کے لیے تھی۔

چیتنیہ کے قول کے مطابق دھوبی، موچی اور دوسری ذات والوں میں بھی محبت اور جذبات کی

شدت بھرپور ہوتی ہے لیکن چنڈی داس کا مذہب تمام انسانیت سے محبت کرنا تھا۔ چنڈی داس کی گیتوں اور نظموں میں عالمی محبت کا پیام ہے۔ ان میں انسان اور خدا مل کر ایک ہو گئے ہیں۔

چیتنیہ نے اپنی سوانح عمری "چیتنیہ چرت مرتیا" میں چنڈی داس کی شاعری کی خوبصورتی اور تحریروں کے اثر کو تسلیم کیا ہے۔

کچھ مدت بعد چنڈی داس کو بشولی دیوی کے مندر میں اس کے باپ کی جگہ 'پروہت' مقرر کر دیا گیا۔ پرانے بنگال میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بشولی دیوی اور دھرم ٹھاکر کی پوجا کی جاتی تھی۔ لوگوں کا یقین ہے کہ دھرم ٹھاکر بعد میں شو کے روپ میں پوجے جانے لگے اور بشولی کو وشالکشی دیوی مان لیا گیا۔
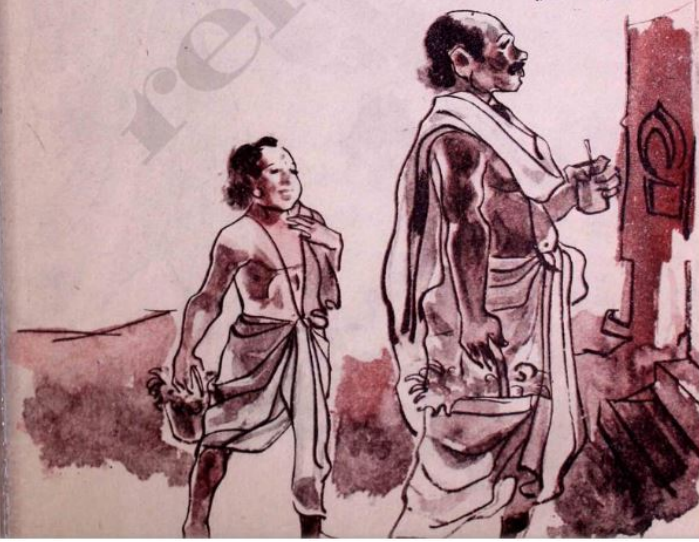
چنڈی داس مندر کا پروہت تو بن گیا تھا لیکن وہ روزمرہ کے رسم و رواج اور پوجا کے قاعدے قانونوں سے بہت پریشان تھا۔ وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت تپسیا میں گزارنا چاہتا تھا۔ اس نے کرشن کی تعریف میں گیت اور نغمے لکھے اور ننور کے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ چنڈی ٹھاکر پاگل ہو گئے ہیں۔

تارا چنڈی داس کو پہلی نظر کے بعد سے ہی بھلا نہ سکی تھی۔ چنڈی داس جب ندی پر نہانے آتے، تارا کپڑے دھونا بھول جاتی تھی۔ وہ اسے اس طرح تکنے لگتی جیسے وہ کوئی دیوتا ہو۔ اس کے گیت اسے بہت اچھے لگتے تھے اور اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ انھیں صدیوں سے سنتی آ رہی ہو۔

بشولی یا چومنڈی خوف و دہشت کی دیوی ہے لیکن اس کا امن و آشتی والا روپ تارا کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے دیوی کا یہی روپ دھوبن تارا کی شکل میں چنڈی داس کے سامنے آیا تھا۔ اس کا نام رامی یا رامی تارا ہوگا لیکن رامی زیادہ مشہور ہے۔ آج بھی رامی اور چنڈی داس ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں رامی کے بغیر چنڈی داس کا تصور نہیں کیا جا سکتا بالکل اسی طرح جیسے رادھا کے بغیر کرشن اور پاروتی کے بغیر شو کے بارے میں ہم نہیں سوچ سکتے۔ بہرحال کچھ بھی کہیے بشولی اس کی شاعری کو خوب متاثر کیا تھا:

بھرامیتے بھرامیتے ننور گرامیتے پردیش جائیا کرے۔
(اپنے سیر و سیاحت میں آخر وہ ننور پہنچ گئی)

رامی سے چنڈی داس کی محبت میں ذات پات اور رنگ و نسل کی کوئی روک نہ تھی۔ چنڈی داس اونچی ذات کا برہمن تھا۔ وہ بے حد وجیہہ اور باوقار تھا پھر بھی اس نے ایک نیچ ذات دھوبن سے محبت کی اور تو اور اس نے اس کی تعریف میں گیت لکھے اور نغمے گائے۔ رامی نے بھی اس کی آواز میں آواز ملائی۔ جہاں جہاں چنڈی داس گیا، رامی سائے کی طرح اس کے ساتھ رہی۔

لوگوں میں بات کا بتنگڑ بنتا گیا۔ اونچی ذات والوں نے اس کو بے عزتی سمجھا۔ پجاریوں نے اسے دیوی کی بے ادبی کہا۔ مذہب کی توہین ہوگئی تھی، کیونکہ ایک برہمن نے ایک دھوبن سے محبت کی تھی۔ اس

زمانے میں مذہبی طبقہ بہت طاقتور تھا۔ یہ لوگ بہت ناراض تھے۔ انھوں نے چنڈی داس کے گناہ کو دھونے کے لیے منتروں کے جاپ کا انتظام کیا۔

ایک شام چنڈی داس رامی کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک بارش شروع ہوگئی۔ وہ بہت دیر تک انتظار کرتا رہا لیکن رامی نہیں آئی۔ چنڈی داس رامی کے گھر گیا۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی، رامی گھر پر ہی تھی۔ وہ اپنی ایک سہیلی سے باتیں کرنے میں اس قدر مگن تھی کہ یہ بھول ہی گئی تھی کہ اسے چنڈی داس سے ملنے جانا ہے جو اس کا منتظر ہوگا۔

چنڈی داس اس زبردست بارش میں ایک درخت کے نیچے کھڑا رہا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا کہ کوئی آواز سن کر رامی گھر سے باہر آئی اور اس نے چنڈی داس کو دیکھا جو پانی میں شرابور سردی سے کانپ رہا تھا۔ رامی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا: "تم اس بھیانک بارش میں کیوں آئے ہو؟"

یہاں سے لوٹنے کے بعد چنڈی داس نے جو گیت لکھا اس کا شمار اس کے بہت ہی مقبول گیتوں میں ہوتا ہے۔

ان کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں کٹواے تار اپیٹھ تک پھیل گئی تھیں۔ چنڈی داس نے شاعری کی ایک نئی طرز کی شروعات کی تھی۔ چنڈی داس اور رامی کے نغمے سننے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔

چنڈی داس کے رویّے کی وجہ سے اس کے باپ کا دل بہت اداس تھا۔ سارے ضابطے اور سارے سماجی قانون پس پشت جا پڑے تھے۔ برہمن اور دوسرے مذہبی ٹھیکے دار بہت خفا تھے۔ رامی اور چنڈی داس کا تعلق مذہب کے لیے ایک مستقل خطرہ تھا۔ چنڈی داس کا ایک بھائی "نکل" نامی تھا۔ نکل نواب کے دربار میں ایک اہم عہدے پر فائز تھا۔ لوگ جب اس پر طنز کرتے تھے تو اس کا سر شرم سے جھک جاتا تھا۔

اس دوران چنڈی داس کا باپ صدمے اٹھا کر مرگیا۔ "ہم اس کی آخری رسوم میں حصہ نہیں لیں گے۔" برہمنوں نے فیصلہ کیا۔ نکل نے جب ان کی بہت خوشامد کی تو انھوں نے کہا: "ہم اسی صورت میں شرادھ میں حصہ لیں گے کہ چنڈی داس پرائشچت کرکے اپنے آپ کو پاک صاف کرے۔"



چنڈی داس مجبور ہوگیا ورنہ اس کے باپ کے آخری رسوم ادا نہیں [کی جائیں گی…] تھے۔ رامی ایک اچھوت تھی۔ اسے اس کو چھوڑ دینا ہوگا۔ چنڈی داس پریشان حال اِدھر سے اُدھر سر ٹکراتا پھرا۔ اس نے اپنے بھائی سے بھی بہت کہا سنا، اس کے قدموں میں بھی گر گیا لیکن نکل نے [اس کی] ایک نہ سنی۔

آخر چنڈی داس راضی ہوگیا۔ جب تک وہ آگ کے سامنے پرائشچت نہیں کرے گا اس کے باپ کی آتما کو شانتی نہ مل سکے گی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ رامی کے ساتھ سخت ناانصافی ہے لیکن وہ خود بھی تو درد سے بھرا ہوا تھا۔

پجاریوں نے رسم و رواج کے مطابق اشنان کرایا۔ اس کے بعد مقدس آگ جلائی گئی اس وقت رامی بھی دور کھڑی ہوئی اسے دیکھنے کے لیے آئی۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

"چنڈی ٹھاکر کیا تم میرے لیے پرائشچت کر رہے ہو؟ کیا تم مجھے چھوڑ دو گے؟"

چنڈی ٹھاکر کا دل شک و شبہ سے بھر گیا۔ اس میں ایک زبردست تناؤ پیدا ہوگیا۔ "مذہب کیا چیز ہے؟ کیا یہ دوسرے انسانوں سے نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ مذہب کی بے حرمتی کیا چیز ہے۔ اگر آج وہ اس لیے پرائشچت کر رہا ہے کہ وہ رامی سے محبت کرتا تھا تو اس طرح اس کے سارے نغمے اور گیت بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔"

"مجھے جانے دو" اس نے بڑے تحمل سے پجاریوں سے کہا۔ برہمنوں نے اسے روکنے کی بہت کوشش
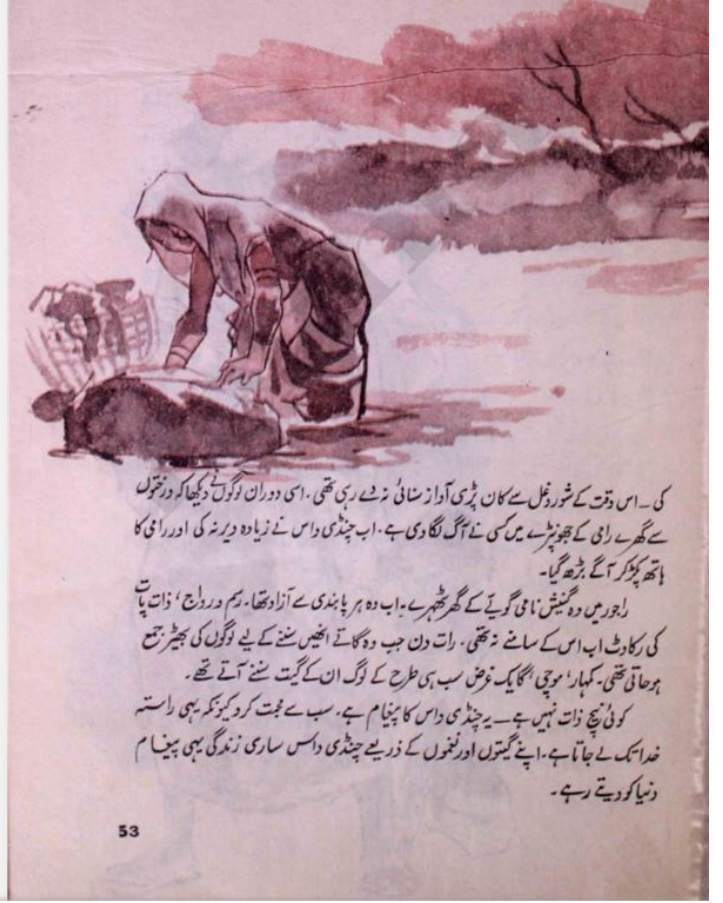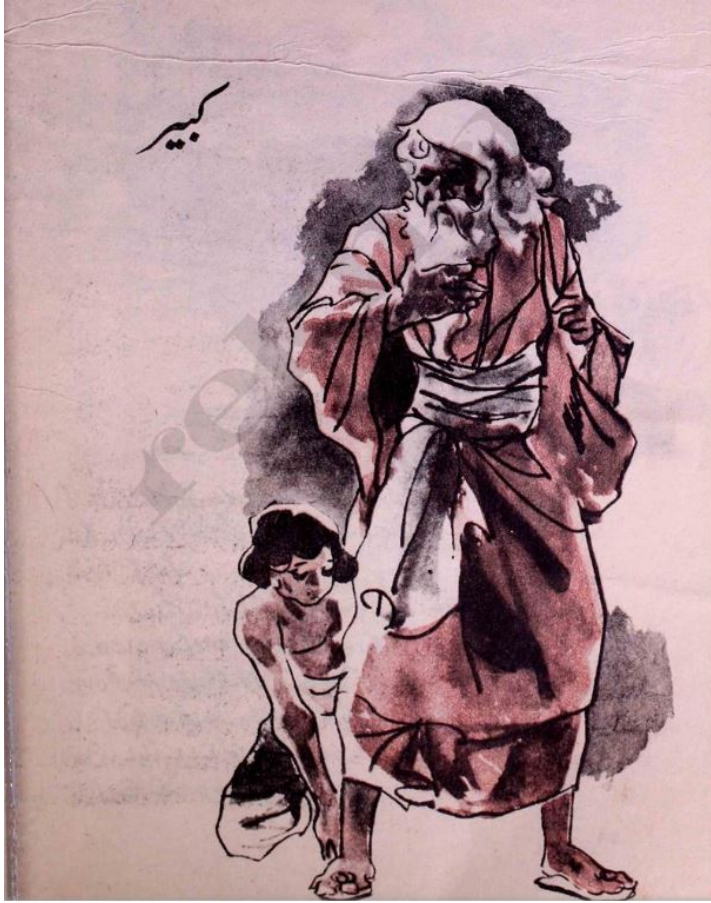
کی ۔ اس وقت کے شور و غل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی ۔ اسی دوران لوگوں نے دیکھا کہ درختوں سے گھرے رامی کے جھونپڑے میں کسی نے آگ لگا دی ہے ۔ اب چنڈی داس نے زیادہ دیر نہ کی اور رامی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔

راجور میں وہ گنیش نامی گویے کے گھر ٹھہرے ۔ اب وہ ہر پابندی سے آزاد تھا ۔ رسم و رواج ، ذات پات کی رکاوٹ اب اس کے سامنے نہ تھی ۔ رات دن جب وہ گاتے انھیں سننے کے لیے لوگوں کی بھیڑ جمع ہو جاتی تھی ۔ کمہار ، موچی ، گایک غرض سب ہی طرح کے لوگ ان کے گیت سننے آتے تھے ۔

کوئی نیچ ذات نہیں ہے ۔۔ یہ چنڈی داس کا پیغام ہے ۔ سب سے محبت کرو کیونکہ یہی راستہ خدا تک لے جاتا ہے ۔ اپنے گیتوں اور نغموں کے ذریعے چنڈی داس ساری زندگی یہی پیغام دنیا کو دیتے رہے ۔

آج سے لگ بھگ پانچ سو برس پہلے کی بات ہے۔ کاشی کے پاس لہرتارا نامی جگہ پر ایک جولاہے نیرو اور اس کی بیوی نیما کو ایک بچہ پڑا ملا۔ بچہ بڑا پیارا تھا۔ انگوٹھا منہ میں ڈالے چُسر چُسر چوس رہا تھا اور چاروں طرف ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ اسے اس سنسان مقام پر اکیلا پڑا دیکھا تو نیما کا دل ممتا سے بھر آیا۔ وہ بچے کو اپنے ساتھ گھر لے جانا چاہتی تھی۔ نیرو کو بھی اس نے راضی کر لیا اور وہ بچے کو اپنے ساتھ گھر لے گئے۔

گھر پہنچ کر نیرو نے رسم و رواج کے مطابق بچہ کا نام رکھنے کے لیے جھٹ پٹ قاضی بلائے۔ انھوں نے قرآن کھول کر جو دیکھا تو بچے کا نام نکلا اکبر۔ جس کا مطلب ہے بڑا اور بزرگ۔ دوبارہ نام نکالا گیا تو نکلا کبریٰ۔ اس کے معنی بھی بڑے ہی کے ہیں۔ قاضی حیرت میں پڑ گئے۔ ایک غریب جولاہے کے بچے کا ایسا نام! خیر بچے کا نام کبیر پڑ گیا۔

غریب جولاہے کے اس گود لیے بچے کو آگے چل کر عظیم صوفی ہونا اور سماج کی اصلاح کرنا تھی۔ کبیر کوئی معمولی شخص نہیں تھے۔ ان کے جنم کی کہانیاں بھی غیر معمولی ہیں۔ ان کے حقیقی ماں باپ کا کبھی کسی کو پتہ نہیں چلا اسی لیے ان کی پیدائش کے بارے میں بہت سی کہانیاں عام ہو گئیں۔

ایک کہانی یہ ہے کہ ایک دن ایک برہمن اپنی بیوہ لڑکی کے ساتھ سوامی رامانند کے درشن کے لیے گئے۔ لڑکی نے جب ان کے پیر چھو کر انھیں سلام کیا تو ان کے منہ سے نکلا "پتر وتی بھو" یعنی بیٹے کی ماں بنو۔ برہمن نے پریشان ہو کر کہا "یہ کیسا آشیرواد دیا آپ نے مہاراج! میری لڑکی تو بیوہ ہے"۔ سوامی جی پہلے تو سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے: "میرا آشیرواد جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ اس کا بیٹا ایک مہان سنت ہوگا"۔

کہتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد ہی لڑکی کے ہاتھ میں ایک پھپھولا نکلا۔ کچھ دن بعد وہ پھوٹا تو اس میں سے ایک جاندار شے نکلی اور پھر زمین پر گرتے ہی وہ انسانی روپ میں تبدیل ہو گئی۔ بچہ کا نام "کرویر" یعنی ہاتھ سے پیدا ہوا ویر پڑ گیا۔ اس طرح کبیر کی پیدائش سے متعلق عجیب و غریب باتیں مشہور ہو گئیں۔



مسلمان جولاہے کے گھر میں پرورش پانے کے باوجود کبیر ہندو دیوتاؤں رام، گووند اور ہری کے نام جپا کرتے تھے۔ اس سے ہندو اور مسلمان دونوں ہی ناخوش تھے۔ مسلمان اس بات سے ناراض تھے کہ وہ ہندو دیوتاؤں کا نام لیتے ہیں اور ہندو اس لیے ناخوش تھے کیونکہ وہ مورتی پوجا، اوہام پرستی اور ذات پات کی مخالفت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کو یہ بھی اعتراض تھا کہ کبیر مسلمان ہو کر بھی وشنوؤں کی طرح رہتے ہیں۔ لوگ اُن سے بار بار پوچھتے کہ آپ کا گرو کون ہے؟ کیونکہ عقیدہ یہ تھا کہ وشنو کا کوئی گرو نہ ہو تو اُسے مکتی نہیں مل سکتی۔ کبیر ان طعنوں اور سوالوں سے تنگ آ گئے۔

اس وقت کاشی میں سوامی رامانند کی بڑی شہرت تھی۔ دور دور سے لوگ اُن سے تعلیم حاصل کرنے آتے۔ کبیر نے ان ہی سے منتر سیکھنے کا فیصلہ کیا۔

سوامی جی روز منہ اندھیرے گنگا اشنان کے لیے جایا کرتے تھے۔ ایک دن سوامی جی گنگا کی طرف جا رہے تھے کہ ان کے پیر کسی سے چھو گئے۔ سوامی جی کے منہ سے نکلا "رام، رام" بس کبیر نے اُسے ہی گرو منتر مان لیا اور یہ بات مشہور کر دی کہ انھوں نے رامانند سے علم حاصل کیا ہے۔ یہ خبر سُن کر زبردا اور رنیا پریشان ہوئے کہ کبیر نے مسلمانوں کا رہن سہن چھوڑ کر تلک لگانا اور کنٹھ مالا پہننا شروع کر دیا ہے۔ ادھر ہندوؤں نے بھی بڑا شور مچایا کہ رامانند نے ایک مسلمان کو کیسے منتر سکھائے۔ سوامی جی تک بات پہنچی تو ان کو بڑی حیرت ہوئی کہنے لگے: "میں نے تو کسی بھی مسلمان کو گرو منتر نہیں دیا۔" انھوں نے کبیر کو بلوا کر پوچھا تو انھوں نے گنگا کے کنارے والا اس دن کا واقعہ سنا دیا۔ سوامی جی بہت خوش ہوئے اور انھیں اپنا شاگرد مان لیا۔

کبیر غیر معمولی سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ ان کے گرو بھی ان کے آگے ہار مان جاتے تھے ایک بار رامانند کے آشرم میں پُرکھوں کا شرادھ تھا۔ پرکھوں کے شرادھ کے دن ان کی پسند کی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ رامانند کے پُرکھوں کو گائے کا دودھ پسند تھا۔ اس لیے رامانند نے کبیر سے گائے کا دودھ لانے کے لیے کہا۔ کبیر برتن لے کر دودھ لانے چلے۔ راستے میں ایک جگہ گائے مری پڑی تھی۔ کبیر نے گائے کے آگے گھاس ڈالی اور وہاں برتن لے کر کھڑے رہے۔ بڑی دیر ہو گئی۔ شرادھ کی ساری تیاری ہو چکی تھی لیکن کبیر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ اس لیے رامانند انھیں ڈھونڈنے چلے تو دیکھا کہ وہ مری ہوئی گائے کے پاس کھڑے ہیں۔ رامانند نے کہا: "ارے یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟" کبیر نے جواب دیا "گرو مہاراج گائے نہ دودھ دے رہی ہے اور نہ ہی چارا کھا رہی ہے۔" رامانند نے ہنس کر کہا "ارے پگلے، یہ گائے تو مری ہوئی ہے گھاس کیسے کھائے گی؟"

یہ سن کر کبیر نے کہا۔ "مہاراج ابھی ابھی مری ہوئی گائے اگر گھاس نہیں کھا سکتی تو برسوں پہلے مرے ہوئے آپ کے پُرکھے دودھ کیسے پئیں گے؟"

رامانند لاجواب ہو گئے۔

کبیر گھر گرہستی والے سنت تھے۔ اپنا کام وہ من لگا کر کرتے تھے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے فرض کو ہی عبادت سمجھے، یہی سچا دھرم ہے۔ انسان کے فرض کا پھول بھگوان کو کسی بھی خوشبودار اور قیمتی پھل سے زیادہ پیارا ہے۔ کپڑے بننے میں کبیر اتنے محو

ہو جاتے تھے کہ اسی میں انھیں خدا کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ ان کے کلام میں بہت سی تشبیہیں اور استعارے اسی دستکاری سے متعلق ہیں۔

جینے کے لیے کام کرنا اور دوسروں کی بھلائی کے لیے آگے آگے رہنا، کبیر کی زندگی بن چکا تھا۔ کپڑا بننا اور پھر بازار میں لے جا کر اسے بیچ آنا۔ منافع کی طرف ان کی ذرا بھی توجہ نہیں تھی۔ کبیر بہت ہمدرد اور نیک دل تھے۔ ایک بار ایک برہمن بازار میں آکر دُکھ بھرے لہجے میں اُن سے بولا: "میں غریب ہوں۔ میری جیب خالی ہے۔ تن ڈھکنے کے لیے مجھے کپڑا چاہیے۔" رحم دل کبیر نے اسے کپڑے کا آدھا تھان دے دیا مگر کئی بھکاری بڑے
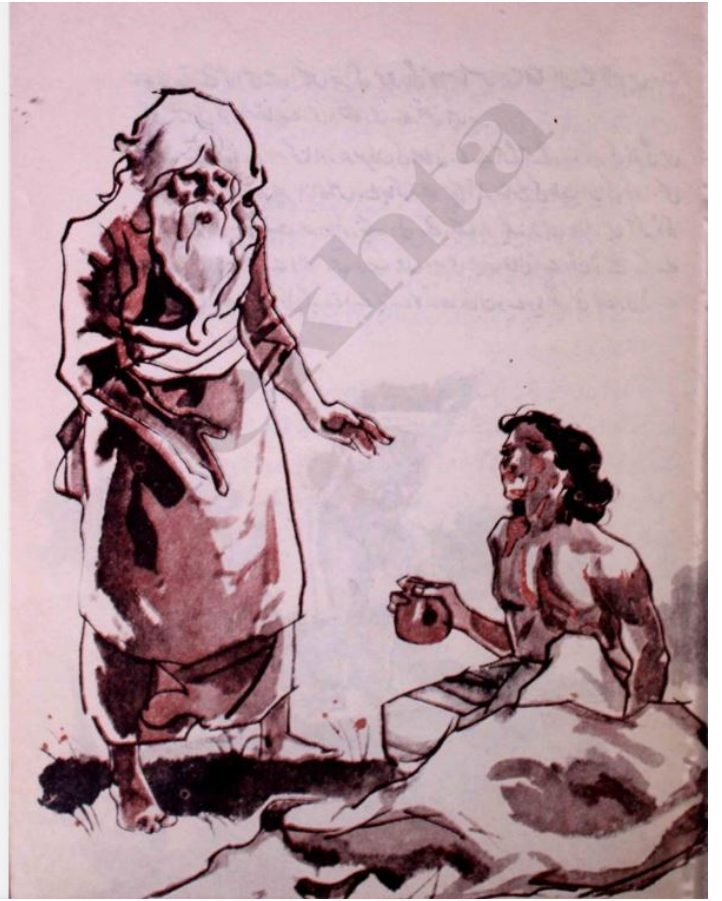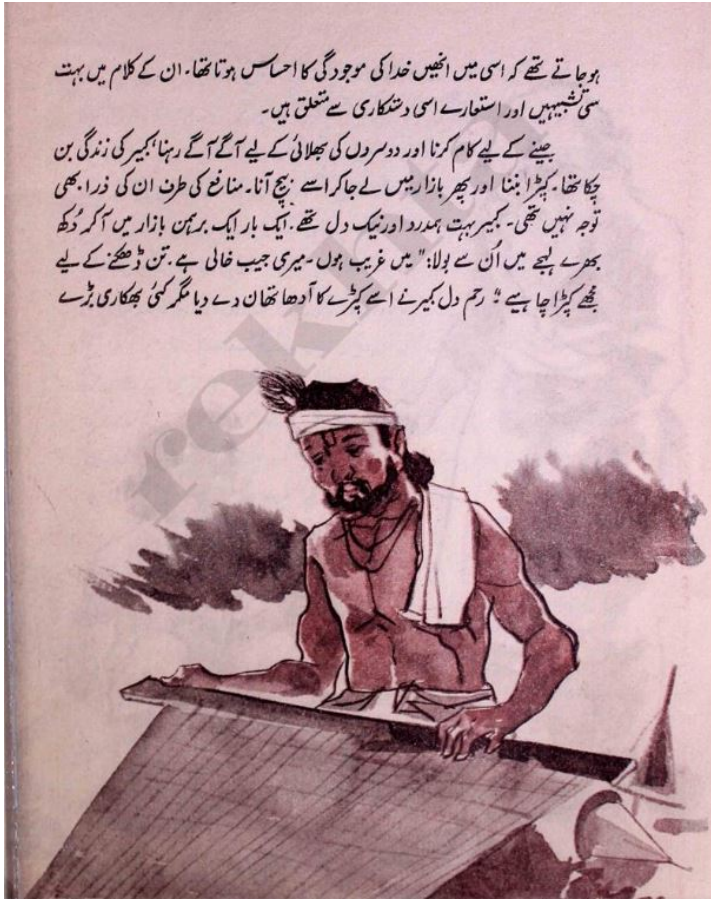
لالچی ہوتے ہیں۔ وہ برہمن بھی ویسا ہی تھا۔ آدھے تھان سے اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے اور کپڑا مانگا۔ کبیر نے باقی کا آدھا تھان بھی اُسے دے دیا اور وہ برہمن کبیر کو دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

مگر کبیر کے سامنے اب یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ گھر کے لیے کھانے پینے کا سامان کیسے خریدیں وہ اداس ہو کر بازار میں ایک طرف بیٹھ گئے۔ اس طرح تین دن گزر گئے۔ گھر کے لوگ بھوکے رہے کیونکہ کبیر کے پاس جمع پونجی کچھ نہ تھی۔ بازار میں کپڑا بیچ کر جب کچھ پیسے آتے تب ان سے کھانے پینے کا سامان خریدا جاتا اور کھانا بنتا۔ نیما کھانا کیسے بناتی؛ بیچاری بھوکی پیاسی کبیر کا انتظار کرتی رہی۔

کہتے ہیں کہ اسی وقت ایک شخص کھانے پینے کا ڈھیر سارا سامان بیل پر لاد کر لے آیا اور کہنے لگا: "یہ سامان آپ کے بیٹے نے بھیجا ہے۔" مگر ماں کو پتہ تھا کہ اس کا بیٹا مفت میں کسی کا احسان کبھی نہیں لے گا۔ اس نے سامان لینے سے انکار کر دیا تو اس شخص نے کہا: "کاشی وشونیشور کے درشن کے لیے راجا آیا تھا۔ اس نے خوش ہو کر یہ سامان بھیجا ہے۔" بعد میں کبیر گھر آئے اور انھیں ساری بات کا پتہ چل گیا۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کی مدد کے لیے خود بھگوان آئے تھے۔ ان کا بھکتی کا جذبہ اور بھی بڑھ گیا۔

کبیر کی بیوی کا نام تھا لوئی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ان کی شاگرد تھی۔

کہانی اس طرح ہے کہ لوئی ایک کٹیا میں رہتی تھی۔ ایک دن دو سادھو اور کبیر اس کے گھر گئے۔ اُس نے تینوں کا سواگت کیا اور دودھ سے بھرے کٹورے ان کے سامنے رکھے۔ دونوں سادھوؤں نے دودھ پی لیا مگر کبیر نے کہا: "میں دودھ نہیں پیوں گا۔ ابھی یہاں پر ایک تپسوی آنے والا ہے، وہ بھوکا ہے۔ مجھ سے زیادہ اُسے دودھ کی ضرورت ہے۔" تھوڑی ہی دیر بعد سچ مچ وہاں ایک تپسوی آ پہنچا۔ وہ بہت بھوکا تھا۔ کبیر نے اپنا دودھ کا



کٹورا اُسے دے دیا۔ اس نے کٹورا منہ سے لگایا اور پل بھر میں خالی کر دیا۔ خوش ہو کر اُس نے کبیر کو آشیرواد دیا۔ یہ چمتکار دیکھ کر لوئی کو بڑا اچنبھا ہوا۔ کبیر کی رحم دلی، سخاوت اور روحانیت سے متاثر ہو کر وہ کبیر کے پیچھے پیچھے چل پڑی اور ان کے ساتھ رہ کر، ان کی خدمت کر کے اس نے اپنی عاقبت سنوار لی۔

کبیر بہت ذہین تھے۔ اپنی نظموں، دوہوں اور کہاوتوں کے ذریعے انھوں نے لوگوں کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ سچا دھرم کیا ہے۔ ظاہر داری انھیں پسند نہ تھی۔ انھوں نے بڑے اعتماد سے کہا ہے کہ انھوں نے تو پربھو کو پریم سے جیت لیا ہے۔

کبیر صرف انسانیت کے دھرم کو مانتے تھے۔ ذات پات، ظاہر داری اور جھوٹے پوجا پاٹ
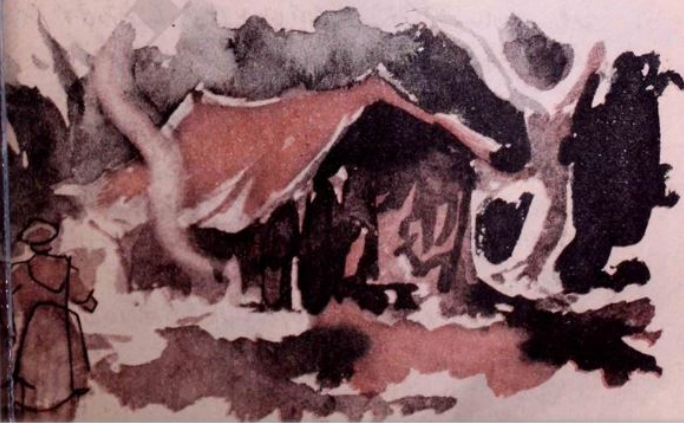
سے انھیں سخت نفرت تھی۔ ہندو اور مسلمانوں دونوں مذہبوں کے ٹھیکیداروں پر انھوں نے سخت نکتہ چینی کی تھی اسی لیے دونوں مذہبوں کے قدامت پسند لوگ ان سے بگڑ گئے تھے لیکن عام لوگ ان سے خوش تھے۔ ہزاروں لوگ کبیر کے درشن کے لیے آتے تھے۔

مگر کبیر کی بڑھتی ہوئی مقبولیت، ان کے کھرے بول، صوفیانہ خیالات کی وجہ سے سیاسی اور مذہبی ٹھیکیدار دونوں ناراض ہو گئے۔ برہمن اور مسلمان دونوں ان کے خلاف سرکار کے پاس شکایتیں لے کر جانے لگے۔ اس وقت کا سلطان سکندر مذہب کے معاملے میں بہت کٹر تھا۔ "مذہب کے روایتی طریقوں اور مذہب کے ذمّے دار پجاریوں کی کبیر عزّت نہیں کرتا" یہ سن کر وہ چڑ گیا۔ اسے بہت بھڑکایا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اُس نے کبیر کا سخت امتحان لیا اور بھگت پرہلاد کی طرح کبیر کو بھی بہت سی آزمائشوں سے گزرنا پڑا مگر خدا کی مہربانی سے ہر بار وہ بچ گئے۔ آزمائشوں کی آگ میں تپ کر وہ اور بھی کندن بن گئے۔

چاروں طرف ان کی جے جے کار ہونے لگی۔

ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ کاشی میں مرنے والا شخص سیدھا سورگ میں جاتا ہے اسی طرح مگھر کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہاں مرنے والا اگلے جنم میں گدھا ہوگا۔ اس اوہام پرستی کو دور کرنے کے لیے کبیر نے مگھر میں ہی سمادھی لینے کا فیصلہ کیا۔ سیکڑوں بھگت وہاں اکٹھا ہو گئے۔ ان کا آخری وقت قریب آیا تو کبیر ایک کٹیا میں داخل ہوئے اور دروازہ بند کرلیا۔ تھوڑی دیر بعد کٹیا سے ایک روشنی نکلی اور کبیر خدا سے جا ملے۔

اب جھگڑا ہونے لگا۔ ہندوؤں نے کہا کہ ہم کبیر کی آخری رسومات ادا کریں گے۔ مسلمان مرید بولے کہ ہم کبیر کو دفن کرکے پیر بنائیں گے۔ ہاتھا پائی کی نوبت آگئی۔ کہتے ہیں کہ اسی وقت غیب سے ایک آواز آئی، "جھگڑا مت کرو۔ کٹیا کھول کر تو دیکھو"۔ لوگوں نے کٹیا کھول کر دیکھا تو ایک چادر کے نیچے گلاب کے پھولوں کا ڈھیر تھا۔ ہندو اور مسلمانوں نے پھول آپس میں بانٹ لیے اور اپنے اپنے طریقے کے مطابق ان کی یادگار بنوائی۔ وہ پھول تو سوکھ گئے مگر کبیر کی نظموں کی تازگی اور مہک سدا رہے گی۔
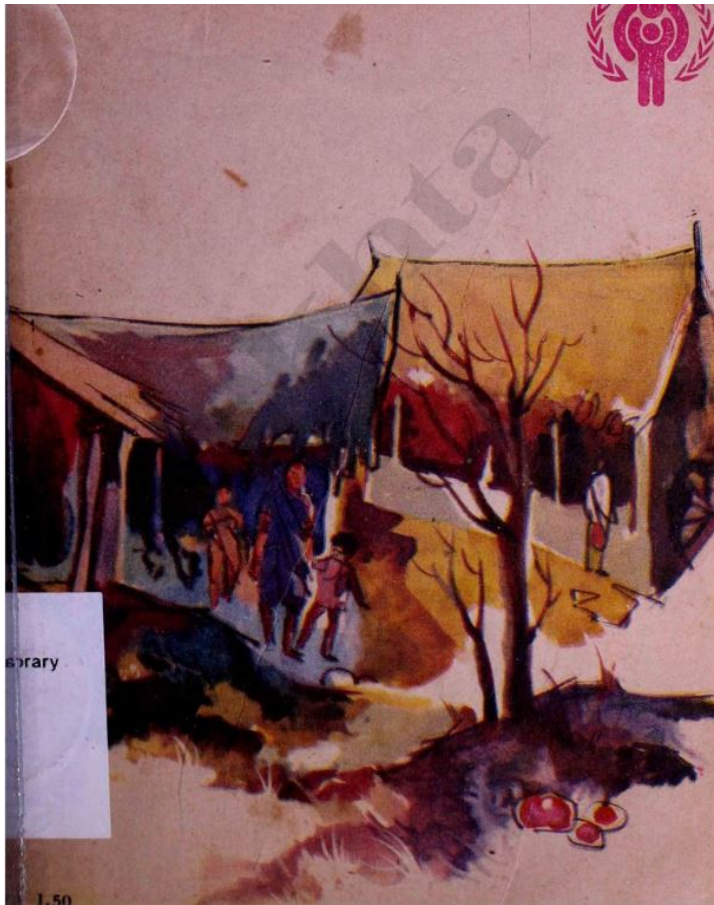
# اس سلسلے کی دوسری کتابیں

ہر کتاب کی قیمت : 1/50

| کتاب | مصنف | مترجم |
|---|---|---|
| بابو (حصہ اول، دوم) | ایف، سی، فرینٹاس | مترجم: صالحہ عابد حسین |
| کشمیر | مالا سنگھ | خدیجہ عظیم |
| پرندوں کی دنیا | جمال آرا | شفیع الدین نیر |
| ہماری ندیوں کی کہانی (اول) | لیلا مجمدار | رضیہ سجاد ظہیر |
| جنت کی سیر اور دوسری کہانیاں | لیلاوتی بھاگوت | ″ |
| ہماری ندیوں کی کہانی (دوم) | ال، وی، ایا | سید احسان |
| رسیلی کہانیاں | منوج داس | صغرا مہدی |
| آزادی کی کہانی (اول) | وشنو پربھاکر | انور کمال حسینی |
| ″ (دوم) | سمنگل پرکاش | ″ |
| ہماری ریلیں | جگجیت سنگھ | عرش ملسیانی |
| آؤ ناٹک کھیلیں | اوما آنند | رفیعہ منظور الامین |
| بہت دن ہوئے (اول) | ایم، جوکسی و پی، ایم، جوشی | رضیہ سجاد ظہیر |
| ″ (دوم) | ″ | پریتم لال |
| بہادروں کی کہانیاں | راجندر اوستھی | انور کمال حسینی |
| روہنت و نندیا | کرشن چیتنیہ | ″ |
| سدا بہار کہانیاں | شانتا رنگا چاری | ″ |
| مورا | ملک راج آنند | ″ |
| سونا کی سیر | تارا تیواڑی | ″ |
| پھول اور شہد کی مکھی | اشوک داور | ″ |
| سب کا ساتھی سب کا دوست | اوما شنکر جوشی | ″ |
| ایجادیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی (اول دوم) | میر نجابت علی | سید احسان |
| بڑا پانی | لیلا مجمدار | صالحہ عابد حسین |
| خالہ بلی کا خاندان | ایم، ڈی، چترویدی | شفیع الدین نیر |
| ہاکی کا کھیل | سردیندو سانیال | پریتم لال |
| ہندوستان کی عظیم کتابیں | منوج داس | ″ |
| اولمپک کھیل اور ان کے ہیرو | ل، دل، ڈیمیلو | سید احسان |
| ڈاک ٹکٹوں کی کہانی | ایس، پی، چٹرجی | ″ |
| درختوں کی دنیا | رسکن بونڈ | منظر الحق علوی |
| چڑیا گھر میں | ″ | مخمور سعیدی |
| شری رام کی کہانی | نسا مہتہ | انیس مرزا |
| مرپا ہاتھی | نکی پٹیل | ایس، اے، رحمٰن |